For more books visit www.4Urdu.com
A-PDF Watermark DEMO: Purchase from www.A-PDF.com to remove the watermark

برکت" کا نزول ۲۷ یا ۲۸ برس بعد آج تک جاری ہے!

ایک روز مسٹر غلام محمد نمونئے میں مبتلا تھے۔ ان کے ایک عزیز دوست میرے پاس بکرے ذبح کرنے کی چھری لے کر آئے۔ چھری چاندی کی طشتری میں دھری ہوئی تھی اور اوپر ایک سبز ریشمی رومال ڈالا ہوا تھا۔ انہوں نے کہا کہ میں اس چھری پر مسٹر غلام محمد کا ہاتھ پھرا لاؤں' کیونکہ وہ اس سے چند بکرے ذبح کر کے ان کی صحت اور سلامتی کے لیے صدقہ دینا چاہتے ہیں۔ میں نے مسٹر غلام محمد کو یہ بات بتائی تو انہوں نے بڑی خوشی سے چھری پر اپنے دونوں ہاتھ کئی بار پھیر دیئے۔ اس کے بعد میں نے کہا۔ "اگر آپ اجازت دیں تو میں ان صاحب کے ساتھ اپنا ڈپٹی سیکرٹری بھی بھیجنا چاہتا ہوں تا کہ صدقہ کی رسم چھری پر ہاتھ پھرانے تک ہی محدود نہ رہے بلکہ بکرے بھی ضرور ذبح ہوں۔"

یہ بات سن کر مسٹر غلام محمد کی آنکھوں میں تیز تیز چمک آئی اور انہوں نے زندگی میں پہلی بار مجھے شاباش دے کر کہا۔ "ہاں' ہاں' ضرور بھیجنا۔ بعد میں مجھے رپورٹ بھی دینا۔"

واپس آ کر جب میں نے ان صاحب کو بتایا کہ مسٹر غلام محمد کی خواہش ہے کہ صدقہ کے وقت ان کا ڈپٹی سیکرٹری بھی ان کی نمائندگی کرے' تو ان کا منہ بن گیا اور وہ بڑے بدمزہ ہو کر میرے کمرے سے نکلے۔

خوشامد کی قینچی عقل و فہم کے پر کاٹ کر انسان کے ذہن کو آزادی پرواز سے محروم کر دیتی ہے۔ خوشامدیوں میں گھرا ہوا انسان شیرے کے قوام میں پھنسی ہوئی مکھی کی طرح بے بس اور معذور ہے۔ رفتہ رفتہ اس کے اپنے حواس معطل ہو جاتے ہیں اور وہ وہی کچھ دیکھتا' سنتا' بولتا' سونگھتا اور محسوس کرتا ہے' جو خوشامدی کیڑے کو کون کی طرح گھس کر اس کے وجود میں پلتے رہتے ہیں۔ جس سربراہ مملکت کی کرسی کو خوشامد کی دیمک لگ جائے اور پائیدار نہیں رہتی' اس کے فیصلے ناقص ہوتے ہیں اور اس کی رائے دوسروں کے قبضہ میں چلی جاتی ہے۔ اگر سربراہ مملکت مسٹر غلام محمد کی طرح جسمانی طور پر مفلوج ہو تو خوشامدیوں کے دوش پر سوار ہو کر وہ سارے ملک کو

For more books visit www.4Urdu.com

خطرے کی صلیب پر لٹکائے رکھتا ہے۔

پرائم منسٹر' وزراء' کمانڈر انچیف اور دیگر اعلیٰ حکام میں کوئی ایسا مائی کا لال نہ تھا جو مسٹر غلام محمد کے روبرو کسی جائز نکتے پر بھی اختلاف رائے کا اظہار کرتا ہو۔ وہ سب ان کی ہاں میں ہاں ملاتے تھے اور ان کے منہ پر جی حضوری کا دم بھرتے تھے۔ لیکن ان کی پیٹھ پیچھے سب ان کا مذاق اڑاتے تھے اور ان کے احکام کو یا تو بالکل نظر انداز کر دیتے تھے یا اپنی خواہش کے مطابق توڑ مروڑ کر عملی جامہ پہناتے تھے۔ کاروبار حکومت کی ہر سطح پر ذاتی پسند اور ناپسند اور شخصی بالادستیوں کا دور دورہ تھا اور مرکز گریز عناصر کو من مانی کاروائیاں کرنے کی کھلی چھٹی تھی۔ خاص طور پر جو لاوا مشرقی پاکستان میں پکنا شروع ہو گیا تھا' اس کی طرف توجہ دینے کی کسی کو فرصت نہ تھی۔ ۱۹۵۴ء کے انتخابات نے مشرقی پاکستان میں سیاست کے ایک نئے رخ اور ایک نئی توانائی کو جنم دیا تھا۔ اس کے مقابلے میں گورنر جنرل نے مرکز میں کٹھ پتلیوں کا جو کھیل رچا رکھا تھا' اس کی حیثیت قرون وسطیٰ کے رنگ میں رنگے ہوئے کسی رجواڑے سے مختلف نہ تھی۔ مولانا بھاشانی نے کاگماری کے جلسنہ عام میں مغربی پاکستان کو "اسلام علیکم" کی دھمکی سنا کر ایک خطرناک علیحدگی پسند رجحان کو زبان دے دی تھی۔ مسٹر غلام محمد کی صدارت میں نت روز مرکزی کابینہ کے اجلاس ہوتے رہتے تھے۔ لیکن ایسا اجلاس کبھی نہ ہوا جس میں مشرقی پاکستان کی نئی صورت حال کا سنجیدگی کے ساتھ سیاسی تجزیہ کیا جائے۔ کابینہ کا اجتماعی ذہن نوکر شاہی کی لکیر کا فقیر تھا۔ وہ مشرقی پاکستان میں ابھرتی ہوئی نئی سیاست کا جواب سیاست سے دینے کی اہلیت نہ رکھتے تھے۔ ان کے ہاتھ میں تو وہی فرسودہ نو آبادیاتی فارمولہ تھا کہ اگر صوبائی حکومت پسند خاطر نہ رہے تو اسے برطرف کر کے صوبے میں گورنر کا راج نافذ کر دیا جائے۔

آئین ساز اسمبلی کے سپیکر مولوی تمیز الدین خاں نے اسمبلی کی برطرفی کو قبول نہ کیا تھا اور گورنر جنرل کے ہنگامی حالات کے خلاف سندھ ہائیکورٹ میں رٹ دائر کر رکھی تھی۔ سندھ ہائیکورٹ نے فیصلہ دیا کہ گورنر جنرل کو اسمبلی برطرف کرنے کا کوئی اختیار

For more books visit www.4Urdu.com

نہ تھا۔ حکومت نے اس فیصلہ کے خلاف فیڈرل کورٹ میں اپیل دائر کر دی۔ فیڈرل کورٹ نے اسمبلی برطرف کرنے میں گورنر جنرل کے فیصلے کو برقرار رکھا۔ اس کے بعد ایک طویل قانونی کشمش کا آغاز ہوا جس کے دوران میں گورنر جنرل نے ایک ایمرجنسی پاورز آرڈی نینس جاری کر کے کئی نئے اختیارات اپنے قبضہ میں لے لیے۔ ان میں ایک تو مغربی پاکستان میں "ون یونٹ" قائم کرنے کا اختیار تھا۔ دوسرا اختیار یہ تھا کہ آئین سازی کے متعلق گورنر جنرل ہر قسم کے انتظامات کرنے کا مجاز ہو گا۔ دراصل مسٹر غلام محمد کا ارادہ یہ تھا کہ وہ آئین ساز اسمبلی کی جگہ اپنی مرضی کے کچھ لوگوں کو نامزد کر کے ایک Constituent Convention قائم کریں اور اس سے آئین سازی کا کام لیں۔ یہ اختیار اسی ارادے کو عملی جامہ پہنانے کے لیے حاصل کیا گیا تھا۔

اپنے ان اقدامات کے لیے قانونی آڑ حاصل کرنے کی نیت سے گورنر جنرل نے فیڈرل کورٹ کو ایک ریفرنس پیش کی کہ وہ اسمبلی کی برطرفی سے پیدا ہونے والی صورت حال کا جائزہ لے کر ان عوامل و عواقب کے متعلق انہیں اپنا مشورہ دے۔

مولوی تمیز الدین کیس' یوسف پٹیل کیس اور گورنر جنرل کی ریفرنس کے نتیجہ کے طور پر فیڈرل کورٹ نے جو فیصلے دیئے' وہ پاکستان کی تاریخ میں بڑی اہمیت کے حامل ہیں۔

اول: اسمبلی کو برطرف کرنے کے لیے گورنر جنرل کا اختیار تسلیم کر لیا گیا۔

دوئم: گورنر جنرل کا یہ اختیار تسلیم نہ کیا گیا کہ وہ نامزد لوگوں کا کنونشن قائم کر کے آئین سازی کا کام اس کے سپرد کر دے۔ بلکہ عدالت نے انہیں مشورہ دیا کہ وہ فوراً برطرف شدہ اسمبلی کی جگہ اسی طرز کی نئی اسمبلی قائم کرنے کے لیے انتخابات منعقد کرائے۔

سوئم: بہت سے ایسے قوانین تھے' جو پچھلی اسمبلی کی طرف سے ابھی باضابطہ طور پر نافذ نہ ہوئے تھے۔ اسمبلی کی برطرفی کے بعد گورنر جنرل نے ایک آرڈیننس کے ذریعہ ان کی توثیق کر دی تھی۔ فیڈرل کورٹ نے کہا کہ عبوری دور تک تو یہ توثیق کام آ

For more books visit www.4Urdu.com


سکتی ہے لیکن جب نئی اسمبلی قائم ہو تو وہ ان قوانین کی باضابطہ منظوری دے۔

ان فیصلوں کے پیچھے "نظریہ ضرورت" کی روح کارفرما تھی۔ ریفرنس کیس میں چیف جسٹس نے خود لکھا ہے:

URDU4U .COM

We have come to the brink of a chasm with only three alternatives before us:
(ا) to turn back the way we came by؛
(ب) to cross the gap by a legal bridge؛
(ب) to hurtle into the chasm beyound any hope of rescue'
(Federal Court of Pakistan، Report on the Special Reference made by His Excellency the Governor General of Pakistan (Lahore، ۱۹۵۵) P۱۱)

"ہم ایک خندق کے کنارے آ پہنچے ہیں'
جہاں ہمارے سامنے صرف تین راستے ہیں۔
(۱) جس راہ سے ہم یہاں تک آئے ہیں اسی راہ واپس مڑ جائیں۔
(۲) خندق پر ایک قانونی پل تعمیر کر کے اسے عبور کر لیں۔
(۳) خندق میں چھلانگ لگا کر تباہی کا شکار ہو جائیں۔"

فیڈرل کورٹ نے مسٹر غلام محمد کی کھودی ہوئی اس خندق پر جو قانونی پل تعمیر کیا وہ Law of Necessity (قانون ضرورت) کے ستون پر کھڑا کیا گیا تھا۔ قانون کی یہ شاخ ہمارے امور سلطنت میں پہلی بار ۱۹۵۵ء میں داخل ہوئی اور بیس پچیس برس میں پھل پھول کر یہ ایسا تنو مند درخت بن گئی' جس کے سائے کے نیچے دب کر بہت سے دوسرے قوانین

For more books visit www.4Urdu.com

کی باڑھ ماری گئی۔

جس زمانے میں یہ ریفرنس فیڈرل کورٹ کے زیرغور تھی' میں نے دیکھا کہ میرا ڈپٹی سیکرٹری فرخ امین ہر دوسرے تیسرے روز مجھے بتائے بغیر لاہور آ جا رہا ہے۔ ایک روز میں نے اسے ڈانٹا کہ میری اجازت کے بغیر وہ اتنی بار لاہور کیوں آتا جاتا ہے؟ اس نے صاف گوئی سے کام لے کر مجھے بتایا کہ وہ گورنر جنرل کا کوئی خفی پیغام کوڈ ورڈ (Code Words) کی صورت چیف جسٹس مسٹر منیر کے پاس لے جاتا ہے اور وہاں سے اسی طرح کوڈ الفاظ میں چیف جسٹس کا پیغام گورنر جنرل کو لا کر دے دیتا ہے۔ فرخ امین نے مزید بتایا کہ غلام محمد صاحب کا تاکیدی حکم تھا کہ وہ یہ بات کسی کو ہرگز نہ بتائے۔ مجھے معلوم نہیں کہ گورنر جنرل اور فیڈرل چیف جسٹس کے مابین اس خفیہ پیغام رسانی کی کیا نوعیت تھی اور نہ ہی یہ وثوق سے کہا جا سکتا ہے کہ اس باہمی خفیہ پیغام رسانی نے فیڈرل کورٹ کے فیصلہ پر کوئی اثر ڈالا بھی تھا یا نہیں؟ البتہ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ایسے موقع پر مملکت کے سربراہ عدلیہ کے سربراہ کا آپس میں خفیہ رابطہ قائم کرنا دونوں کو زیب نہ دیتا تھا۔

خدا خدا کر کے مسٹر غلام محمد نے کسی قدر بیزاری سے فیڈرل کورٹ کا مشورہ تسلیم کر لیا اور ایک آرڈیننس کے ذریعہ نئی آئین ساز اسمبلی قائم کرنے کا فیصلہ ہو گیا۔ جس روز آرڈیننس تیار ہو رہا تھا' مسٹر غلام محمد نے مجھے حکم دیا کہ جس وقت بھی کاغذات مکمل ہو کر آ جائیں' میں فوراً ان سے دستخط کروا لوں۔ اگر وہ سوئے ہوئے بھی ہوں تب بھی انہیں جگا کر دستخط لے لیے جائیں۔ میں اپنے دفتر میں بیٹھا انتظار کرتا رہا۔ سارے کاغذات آدھی رات کے قریب موصول ہوئے۔ میں انہیں لے کر مسٹر غلام محمد کے بیڈروم میں گیا۔ وہ اپنے بستر پر گہری نیند سوئے پڑے تھے۔ اس وقت ان کی قوت ارادی کا ڈائنمو بند تھا اور ان کا جسم بوسیدہ ہڈیوں کے ڈھانچے کی طرح پلنگ پر بکھرا ہوا تھا' جیسے کسی پرانی قبر نے اپنے مردے کو اگل کر باہر پھینک دیا ہو۔ میں نے

For more books visit www.4Urdu.com

ان کے ذاتی ملازم کی مدد سے بڑی مشکل کے ساتھ انہیں جگایا۔ بیداری کی لہر ان کے تن بدن میں اس طرح رک رک کر' ٹھہر ٹھہر کر داخل ہوئی جیسے بہت سی چیونٹیاں روٹی کے ٹکڑے کو گھسیٹ گھسیٹ کر دیوار پر چڑھاتی ہیں اور وہ بار بار ان کی گرفت سے پھسل پھسل کر نیچے گرتا رہتا ہے۔ مسٹر غلام محمد کافی دیر تک اپنی پیلی پیلی آنکھیں جھپکا جھپکا کر خلا میں گھورتے رہے۔ پھر اچانک انہوں نے مجھے پہچانا اور اس کے ساتھ ہی وہ فوراً گورنر جنرل کے سنگھاسن پر براجمان ہو گئے۔ پہلے انہوں نے وزارت قانون کو کچھ جلی کٹی سنائیں' جو اتنی ست رفتاری سے کام کرتے ہیں کہ سربراہ مملکت چین کی نیند بھی نہیں سو سکتا۔ پھر انہوں نے کاغذات پر دستخط کئے اور چائے کے ساتھ انڈے کا حلوہ تیار کرنے کا آرڈر دیا۔ یہ اس بات کی علامت تھی کہ اب سٹاف کے کچھ افراد کو بھی حاضری کا حکم دیا جائے گا اور اس کے بعد یہ محفل صبح تین چار بجے اس وقت برخاست ہو گی' جب انہیں نیند آور ٹیکہ لگا کر دوبارہ سلا دیا جائے گا۔ میرے پاس دستخط شدہ کاغذات وزارت قانون میں واپس پہنچانے کا بہانہ موجود تھا۔ میں نے اسے کامیابی سے استعمال کیا اور وہاں سے کھسک کر گھر آ گیا۔

اسی عرصہ میں مرکزی کابینہ میں بھی دو بڑی اہمیت کے مالک نئے چہرے داخل ہو چکے تھے۔ ایک تو صوبہ سرحد کے مشہور کانگرسی لیڈر ڈاکٹر خاں صاحب تھے۔ وہ منسٹر آف کمیونکیشنز بنے۔ دوسرے مسٹر حسین شہید سہروردی تھے جن کے سپرد وزارت قانون ہوئی۔ ڈاکٹر خاں صاحب کی جنرل اسکندر مرزا سے ذاتی دوستی تھی۔ اس دوستی کی ابتدا اس وقت ہوئی جب اسکندر مرزا صاحب پشاور کے ڈپٹی کمشنر تھے۔ سنی سنائی روایت ہے کہ ایک بار کانگرسی لیڈر جلوس کی قیادت کر رہے تھے۔ اسکندر مرزا نے جلوس منتشر کرنے کے لیے کوئی پولیس طلب نہ کی بلکہ اس کے خیر مقدم کے لیے جگہ جگہ ٹھنڈے شربت کی سبیلیں قائم کر دیں۔ ہر سبیل پر جلوس والوں کو بڑے تپاک سے شربت پیش کیا جاتا تھا۔ گرمی کے دن تھے۔ کانگرسیوں نے بڑے شوق سے شربت پیا' جس میں جمالگوٹہ

For more books visit www.4Urdu.com

ملایا ہوا تھا۔ کچھ دیر کے بعد سب کے پیٹ میں ایسا مروڑ اٹھا کہ ہزاروں کا جلوس آن کی آن منتشر ہو گیا۔

URDU4U.COM

جب ڈاکٹر خان صاحب مرکزی کابینہ میں شامل ہو گئے تو ایک روز جنرل اسکندر مرزا نے چند افسروں کو برسبیل تذکرہ یہ نصیحت بھی کی۔ ڈاکٹر خاں صاحب کو خوش رکھنے کا خاص خیال رکھا کرو۔ اس شخص نے ساری عمر جیل کی ہوا کھائی ہے یا پولیس کے ڈنڈے کھائے ہیں۔ ہم اسے بڑی مشکل سے گھیر گھار کر حکومت میں لائے ہیں۔ اب اسے گڈ لائف کا ایسا چسکا لگاؤ کہ وہ اس پنجرے سے باہر نہ نکل سکے۔"

مسٹر سہروردی کہنے کو تو وزیر قانون تھے' لیکن دراصل ان کی نظر وزارت عظمیٰ پر تھی۔ وہ پرائم منسٹر محمد علی بوگرا کو ناقابل توجہ سمجھ کر ان کے ساتھ کج خلقی سے پیش آتے تھے اور کابینہ کی میٹنگ میں اکثر اس کی سبکی کرتے رہتے تھے۔ ایک بار کابینہ کے اجلاس میں وزیراعظم کسی مسئلہ کی وضاحت کر رہے تھے۔ مسٹر سہروردی نے اپنی لاتعلقی اور بے التفاتی کا اظہار کرنے کے لیے اپنے بیگ سے بیٹری سے چلنے والا شیور نکالا اور وہیں بیٹھے بیٹھے اپنی داڑھی مونڈنے میں مصروف ہو گئے۔ البتہ ایک راز انہوں نے بہت اچھی طرح پا لیا تھا۔ وہ یہ کہ جس طرز کا نظام حکومت اس وقت ملک میں رائج تھا اس میں عروج حاصل کرنے کے لیے گورنر جنرل کی خوشنودی حاصل کرنا لازمی ہے۔ چنانچہ وہ اس کے لیے حسب توفیق ہاتھ پاؤں مارے رہتے تھے۔ انہیں فوٹو گرافی کا شوق تھا۔ وہ ساکت اور متحرک تصویریں کھینچنے کے کیمرے کندھے سے لٹکائے مختلف تقاریب میں مسٹر غلام محمد کی تصویر کشی میں نمایاں رہنے کی کوشش میں لگے رہتے تھے۔ اس کے علاوہ وہ گورنر جنرل ہاؤس میں بھی بہت آنے جانے لگے تھے۔ ہر مرتبہ آنے کا مقصد گورنر جنرل سے ملاقات کرنا نہ ہوتا تھا بلکہ وہ مس بورل کے کمرے میں بیٹھ کر کافی وقت خوش گپیوں میں گزارا کرتے تھے۔ مسٹر غلام محمد کی طرح مسٹر سہروردی بھی خوبصورت عورتوں کی محفل کے شوقین تھے۔ اڑتے اڑتے یہ خبر مسٹر غلام محمد تک

For more books visit www.4Urdu.com

پہنچی تو جذبہ رقابت نے ان کے سینے میں جوش مارا اور انہوں نے بلا کر میری جواب طلبی کی۔

"یہ سہروردی روتھ کے کمرے میں اتنی اتنی دیر آ کر کیوں بیٹھتا ہے؟" مسٹر غلام محمد نے پوچھا۔

URDU4U.COM

میں نے جواب دیا کہ میں تو اپنے کام میں مصروف رہتا ہوں۔ دوسروں پر چوکیداری کرنے کا مجھے وقت نہیں ملتا۔ اس پر وہ آتش زیرپا ہو گئے اور کڑک کر بولے' "جا کر اسے کہہ دو کہ اگر اس نے دوبارہ ایسی حرکت کی تو میں اس کی ٹانگیں توڑ دوں گا۔"

سہروردی صاحب سے میری قحط بنگال کے دنوں سے شناسائی تھی۔ میں اسی شام ان کی کوٹھی پر حاضر ہوا اور ان کو ساری روئداد سنا ڈالی۔ اس کے بعد وہ کافی محتاط ہو گئے۔

مسٹر غلام محمد بھی کئی روز تک اپنی پہیوں والی کرسی پر بیٹھ کر دن میں متعدد بار مس بورل کے کمرے پر یہ دیکھنے کے لیے چھاپہ مارتے رہے کہ کہیں مسٹر سہروردی تو وہاں نہیں بیٹھے۔

نئی اسمبلی قائم کرنے کا حکم مان کر مسٹر غلام محمد کے دلی عزائم کو شکست فاش نصیب ہوئی تھی کیونکہ وہ تو اپنی مرضی کا ساٹھ رکنی آئین ساز کنونشن کھڑا کر کے کام چلانا چاہتے تھے۔ اس ذاتی ہزیمت کا غم غلط کرنے کے لیے انہوں نے اپنی کھوئی ہوئی جسمانی قوتوں کو بحال کرنے کی ٹھان لی۔ اس مقصد کے لیے لکھنؤ سے ایک حکیم صاحب طلب کیے گئے' جو نابینا تھے اور ان کی عمر ایک سو پانچ برس سے اوپر بتائی جاتی تھی۔ ان کے ساتھ ان کا ایک بیٹا بھی تھا جس کی عمر دس برس کے قریب تھی۔ یہ برخودار حکیم صاحب کی عمر کے پچانویں برس میں پیدا ہوا تھا۔ اس لیے اسے ان کی طبابت اور خدافت کا جیتا جاگتا سرٹیفکیٹ تسلیم کیا جاتا تھا۔ حکیم صاحب کے آتے ہی گورنر جنرل ہاؤس کا ایک حصہ طبی دواخانے میں تبدیل ہو گیا۔ دن بھر ہاون دستہ چلتا تھا اور حکیم صاحب کی خواہش کے مطابق جڑی بوٹیاں حاضر ہوتی رہتی تھیں۔ دو تین بار انہوں نے سو سو

For more books visit www.4Urdu.com

زندہ اور صحت مند چڑوں کی فرمائش کی' جو ہم نے بڑی مشکل سے کمشنر حیدر آباد کے ذریعہ مضافات سے سندھ سے حاصل کئے۔ چڑوں کو ذبح کر کے ان کا مغز تو کسی دوا میں استعمال ہوتا تھا اور گوشت کی یخنی بنا کر حکیم صاحب خود نوش فرما لیتے تھے۔ ایک بار انہوں نے بکری کا ایسا بچہ طلب فرمایا' جسے پیدا ہونے کے بعد آنکھیں کھولنے سے پہلے ذبح کیا گیا ہو۔ گورنر ہاؤس کے کئی ملازم شہر کی حاملہ بکریوں کے سرہانے جا بیٹھے اور کسی نہ کسی طرح حکیم صاحب کی یہ فرمائش بھی پوری کی گئی۔ ان مغزیات اور لحمیات وغیرہ سے انواع و اقسام کی مقوی ادویات اور کشتہ جات تیار ہوتے تھے جنہیں مسٹر غلام محمد کو بڑے اہتمام سے کھلایا جاتا تھا۔ اس ساری کاروائی کا اور کوئی نتیجہ تو برآمد نہ ہوا البتہ ان کا بلڈ پریشر مزید بڑھ گیا اور ایک روز وہ اچانک بے ہوش ہو کر کوما میں چلے گئے۔ حکیم صاحب تو بستر بوریہ سنبھال کر رفو چکر ہو گئے اور گورنر جنرل کو آکسیجن لگا دی گئی۔

مسٹر غلام محمد کے ذاتی معالج کرنل (بعد میں بریگیڈیئر) سرور دن رات ان کے پاس رہے اگلے روز شام کے چار بجے کے قریب انہوں نے مجھے بتایا کہ گورنر جنرل کی زندگی کا چراغ گل ہونے کے قریب ہے' اس لیے میں پرائم منسٹر اور کابینہ کے دوسرے وزیروں کو اطلاع دے دوں کہ اگر وہ ان کا آخری دیدار کرنا چاہتے ہیں تو فوراً یہاں پہنچ جائیں۔ مسٹر غلام محمد کے بیڈ روم کے دروازے کھول دیئے گئے اور دیکھتے ہی دیکھتے سارا کمرہ وزیراعظم سمیت کابینہ کے ممبروں اور گورنر جنرل کے ذاتی عملے سے کھچا کھچ بھر گیا۔ وزیر دفاع اور کمانڈر انچیف جنرل محمد ایوب خاں فوجی وردی میں ملبوس تھے انہوں نے بستر کے پاس کھڑے ہو کر گونر جنرل کو الوداعی سلیوٹ کیا اور ان کی مدح میں چند فقرے کہے۔ ان کی دیکھا دیکھی چند دوسرے وزیر بھی اسی قسم کی تقریریں کرنے کے لیے پر تول رہے تھے کہ یکایک مسٹر غلام محمد کے منہ پر لگے ہوئے آکسیجن ماسک میں کچھ جنبش سی ہوئی۔ پھر ایک ہاتھ ہلا' پھر دوسرا ہلا' اور کرنل سرور نے بڑی خوشی سے اعلان

For more books visit www.4Urdu.com

کیا کہ گورنر جنرل ہوش میں آ رہے ہیں۔ یہ سنتے ہی ساری کی ساری کیبنٹ سر پر پاؤں رکھ کر وہاں سے بھاگ گئی اور تھوڑی دیر کے بعد مسٹر غلام محمد تکیوں کے سہارے بیٹھے چائے اور کسٹرڈ پڈنگ نوش فرما رہے تھے اور ساتھ ہی اپنے سٹاف کے ایک ایک فرد کو الگ الگ بلا کر تحقیق فرما رہے تھے کہ ان کی بے ہوشی کے دوران کون کتنا خوش تھا اور کون کتنا غمگین تھا۔

اس کے بعد مسٹر غلام محمد پر پے در پے نئی بیماریوں کے حملے شروع ہو گئے۔ کبھی تیز بخار، کبھی نمونیہ، کبھی پلورسی، کبھی بلڈ پریشر------ دو چار ہفتوں کے اندر اندر وہ بستر کے ساتھ چپک کر رہ گئے۔ اب فیصلہ ہوا کہ انہیں علاج کی خاطر زیورچ (سوئٹزرلینڈ) بھیج دیا جائے۔ ایک سپر کانسٹیلیشن ہوائی جہاز چارٹر کیا گیا اور مسٹر غلام محمد کو سٹریچر پر لٹا کر خفیہ طور پر جہاز میں پہنچا دیا گیا۔ پرائم منسٹر محمد علی بوگرا دوسرے چند وزیروں کے ساتھ میرے پاس آئے اور کہا کہ میں گورنر جنرل کی کار میں مسٹر غلام محمد کا روپ دھار کر ائیرپورٹ تک چلوں۔ مجھے یہ تجویز بڑی بے تکی اور مضحکہ خیز محسوس ہوئی اور میں نے یہ سوانگ رچانے سے صاف انکار کر دیا۔ اول تو مسٹر غلام محمد کی شکل و صورت کے ساتھ میری کوئی مشابہت نہ تھی۔ دوسرے انہیں پہلے ہی سے خاموشی سے ہوائی جہاز میں پہنچا دیا گیا تھا اور اب ان کی روانگی کا نقلی جلوس نکالنے کی بالکل کوئی ضرورت نہ تھی۔ لیکن وزیراعظم اور ان کے رفقاء ہاتھ دھو کر میرے پیچھے پڑ گئے اور جب حکومت کا سربراہ اس قسم کا احمقانہ حکم صادر کرے تو سرکاری ملازم صرف احتجاج کر سکتا ہے، انکار نہیں کر سکتا۔ چنانچہ مجبور ہو کر میں نے کالا چشمہ لگا کر سیاہ رنگ کی جناح کیپ پہنی اور گورنر جنرل کی کار میں مسٹر غلام محمد کے انداز میں سکڑ کر بیٹھ گیا۔ ایک اے۔ ڈی۔ سی میرے ساتھ اور دوسرا اگلی سیٹ پر بیٹھا۔ کار پر ایک طرف گورنر جنرل کا فلیگ اور دوسری طرف پاکستان کا پرچم لگا دیئے گئے۔ ہمارے دائیں بائیں، آگے پیچھے موٹر سائیکل سوار فوجیوں کا دستہ تھا۔ پھر سیکورٹی پولیس کی گاڑیاں تھیں۔ اس

For more books visit www.4Urdu.com

کے بعد وزیراعظم کی کار تھی۔ ان کے پیچھے دوسرے وزیروں اور افسروں کی گاڑیاں تھیں۔

ہمارا یہ قافلہ بڑی شان و شوکت سے روانہ ہوا لیکن راستے بھر کسی نے اس کا کوئی نوٹس نہ لیا کیونکہ پولیس والوں کی مہربانی سے ائیرپورٹ تک ساری سڑک سنسان پڑی تھی۔ سارے راستہ مجھے یہی خیال آتا رہا کہ اس وقت ہم سب لوگ مل جل کر گورنر جنرل کے فلیگ اور پاکستانی پرچم کی جی بھر کر بے حرمتی کر رہے ہیں۔

ائیرپورٹ پر زیورچ جانے والا جہاز ہینگر کے اندر کھڑا تھا۔ وزیر قانون مسٹر سہروردی اپنے کیمروں سے لیس اس کے آس پاس منڈلا رہے تھے۔ ابھی تک انہیں یہ معلوم نہ ہوا تھا کہ مسٹر غلام محمد جہاز کے اندر پہنچا دیئے گئے ہیں۔ جب ہمارا جلوس وہاں پہنچا تو وہ بڑے شوق سے گورنر جنرل کی مخصوص کار کی طرف لپکے اور رکتے ہی اس کا دروازہ بڑے احترام سے کھولا۔ کار سے مسٹر غلام محمد کی جگہ جب میں برآمد ہوا' تو مسٹر سہروردی ہکا بکا رہ گئے۔ انہوں نے حیرت سے پوچھا۔ "یہ کیا تماشا ہے؟"

میں نے انہیں سارا ماجرا سنایا' تو مسٹر غلام محمد سے ملاقات کرنے ہوائی جہاز کی طرف لپکے۔ لیکن کرنل سرور نے انہیں یہ کہہ کر روک دیا کہ گورنر جنرل اس وقت کوما میں ہیں۔

زیورچ کے کلینک میں علاج معالجہ کے بعد ان کی طبیعت کچھ سنبھلی' تو ایک روز وہ پکنک منانے ایک پر فضا مقام پر گئے۔ لنچ کے وقت ایک ریستوران میں سٹاف کو الگ میز پر بٹھایا گیا اور مسٹر غلام محمد مس بورل اور اس کی والدہ کے ساتھ علیحدہ ٹیبل پر بیٹھے کھانے کے دوران ان پر فالج کا ایک اور حملہ ہوا اور انہیں ایمبولینس میں ڈال کر زیورچ والے کلینک میں داخل کر دیا گیا۔

کچھ عرصہ بعد جب مسٹر غلام محمد واپس کراچی آئے تو ان کی دماغی حالت اور بھی پیچیدگی اختیار کر چکی تھی۔ وہ صبح سویرے سوٹ بوٹ پہن کر کیبنٹ روم میں آ جاتے تھے۔ اپنے اسٹاف کے مختلف افراد کو جمع کر کے ہر روز نئی کابینہ بناتے تھے۔ ان سے حلف اٹھواتے تھے۔ پورٹ فولیوز تقسیم کرتے تھے اور اس کے بعد گھنٹوں تک کیبنٹ میٹنگ

For more books visit www.4Urdu.com

ہوتی تھی' جس میں وہ خود لگاتار ایسی باتیں بولتے رہتے تھے جو کسی کی سمجھ میں نہ آتی تھیں۔

ایک روز وزیر داخلہ کے پرائیویٹ سیکرٹری کا ٹیلیفون آیا کہ اسکندر مرزا صاحب نے شام کے پانچ بجے اپنے گھر چائے پر بلایا ہے۔ وہاں پر جنرل ایوب کاں' چوہدری محمد علی اور گورنر جنرل کے معالج کرنل سرور پہلے سے موجود تھے۔ علیک سلیک کے بعد جو گفتگو ہوئی وہ کچھ اس طرح کی تھی:

اسکندر مرزا: گورنر جنرل کی صحت کے بار میں ہم نے بڑی تشویشناک خبریں سنیں ہیں۔ ہمارا خیال ہے اب انہیں مکمل آرام کی ضرورت ہے۔

جنرل ایوب خاں: سوال یہ ہے' کیا وہ رضا مندی سے استعفیٰ دینے پر تیار ہو جائیں گے؟

میں: خوشی سے تو تیار نہ ہوں گے۔ لیکن اگر انہیں سمجھا دیا جائے کہ اس کے بغیر اور کوئی چارہ نہیں تو شاید مان جائیں۔

اسکندر مرزا: ہم نے سنا ہے وہ تم پر بہت اعتماد کرتے ہیں۔ وہ صرف اس کاغذ پر دستخط کرتے ہیں جو تم ان کے پاس لے جاؤ۔

میں: جی نہیں۔ ایسی بات نہیں۔ میرے علاوہ وہ مس بورل اور میرے ڈپٹی سیکرٹری فرخ امین پر بھی مکمل اعتماد کرتے ہیں۔

جنرل ایوب خاں: مس بورل تو پاکستانی نہیں۔

اسکندر مرزا: مس بورل کو چھوڑ کر تم دونوں میں سے کون اس کام میں زیادہ مدد دے سکتا ہے؟

میں: جناب' میری حقیر رائے میں استعفیٰ کے معاملے میں گورنر جنرل کے ذاتی عملے کو بیچ میں نہیں لانا چاہیے۔ اصولاً تو یہ فرض پرائم منسٹر کو سر انجام دینا چاہیے۔ اگر کسی وجہ سے یہ ممکن نہ ہو' تو یہ کام مسٹر غلام محمد کے اہل خاندان کے سپرد کر دینا چاہیے۔ وہ سمجھا بجھا کر انہیں مستعفی ہونے پر رضا مند کر سکتے ہیں۔

For more books visit www.4Urdu.com

میرا خیال ہے کہ میری یہ بات جنرل اسکندر مرزا اور جنرل ایوب خاں کو پسند نہ آئی اور وہ برا سا منہ بنا کر خاموش ہو گئے۔ لیکن چوہدری محمد علی نے بڑی گرمجوشی سے میرے کندھے پر ہاتھ رکھا اور کہا۔ "اچھا بھئی' شکریہ۔ تم نے صحیح رائے دی ہے۔"

چند ہفتوں کے اندر اندر مسٹر غلام محمد کی سبکدوشی کا مسئلہ طے ہو گیا۔ پہلے انہوں نے کچھ چھٹی لی اور پھر مستعفی ہو گئے۔ جس روز انہوں نے چارج چھوڑا' مجھے حکم ملا کہ میں ان کی طرف سے قوم کے نام ایک پیغام لکھوں اور ریڈیو سے اسے براڈ کاسٹ بھی کروں۔ یہ بڑا مشکل کام تھا کیونکہ گورنر جنرل کے طور پر مسٹر غلام محمد نے کوئی ایسا تعمیری کارنامہ سرانجام نہ دیا تھا جسے ان کے الوداعی پیغام میں فخر کے ساتھ بیان کیا جا سکتا۔ میں نے پانچ منٹ کا ایک رسمی سا پیغام لکھا' جو پرانی دہرائی ہوئی عامیانہ' فرسودہ اور پیش پا افتادہ باتوں اور اقوال پر مشتمل تھا۔ اس تقریر کا ڈرافٹ منظور کرانے کے لیے میں پرائم منسٹر سمیت کئی وزیروں کے پاس گیا' لیکن کسی نے اسے پڑھنے تک کی زحمت گوارا نہ کی' کیونکہ کرسی سے اترتے ہوئے گورنر جنرل کے ساتھ کسی کو کیا دلچسپی ہو سکتی تھی؟ چنانچہ میں نے اسی غیر منظور شدہ ڈرافٹ کو شام کے وقت نیشنل ہک اپ میں ریڈیو سے براڈ کاسٹ کر دیا۔ ریڈیو اسٹیشن سے نکلا' تو باہر سڑک پر مس بورل کی خوبصورت دورنگی کار کھڑی تھی۔ ماں بیٹی کار کے ریڈیو پر میرا براڈ کاسٹ سن کر زار و قطار رو رہی تھیں۔ اس روز مسٹر غلام محمد کے جانے پر شاید یہی چار آنکھیں تھیں جو اس قدر شدت سے اشکبار ہوئی ہوں اور یہ آنکھیں بھی پاکستانی نہ تھیں۔

گورنر جنرل کے عہدہ سے سبکدوش ہونے کے بعد مسٹر غلام محمد اپنی بیٹی کے ہاں کلفٹن منتقل ہو گئے۔ سرکاری ذمہ داریوں کا بوجھ اترتے ہی ان کی جسمانی اور دماغی صحت حیرت انگیز طور پر اچھی ہو گئی۔ کرنل سرور باقاعدگی کے ساتھ ان کا علاج کرتے رہے۔ کبھی کبھی اپنی خط و کتابت میں مدد دینے کے لیے وہ مجھے بھی بلا لیتے تھے اور بڑی شفقت سے پیش آتے تھے۔ ایک بار وہ مجھے اپنے ساتھ سینما دکھانے بھی لے گئے۔

For more books visit www.4Urdu.com

وفات سے چند روز پہلے ان پر ایک عجیب دھن سوار ہو گئی۔ انہوں نے اپنے ڈاکٹر کرنل سرور سے کہا کہ وہ ہوائی جہاز چارٹر کر کے دیوا شریف جانا چاہتے ہیں۔ دیوا شریف لکھنؤ کے قریب کوئی جگہ ہے جہاں حاجی وارث علی شاہ دفن ہیں۔ یہ بزرگ غالباً بیسویں صدی کے اوائل میں فوت ہوئے تھے اور مسٹر غلام محمد کو ان کے ساتھ گہری عقیدت تھی۔ وہ ان کی فوٹو ہمیشہ اپنے بستر کے قریب تپائی پر رکھا کرتے تھے۔ انہوں نے ان کی ملوظات اور سوانح حیات شائع کروانے میں بھی کافی حصہ لیا تھا اور تقسیم سے پہلے کئی بار دیوا شریف میں ان کے مزار پر حاضری دے چکے تھے۔ حاجی وارث علی شاہ کے حالات زندگی پڑھ کر محسوس ہوتا ہے کہ وہ درویشانہ اور قلندرانہ وضع کے بزرگ تھے۔ لیکن ان کے مسلک نے مسٹر غلام محمد پر کچھ بھی اثر نہ کیا تھا' کیونکہ وہ جب تک جئے حب جاہ اور حب دنیا کا عبرتناک مجسمہ بن کر جئے۔ اپنی زندگی کے آخری روز بھی ان کو دیوا شریف جانے کی لگن لگی ہوئی تھی' لیکن کارکنان قضا و قدر کو کچھ اور منظور تھا۔ اسی رات ان کا انتقال ہو گیا۔

ان کی وفات کی خبر سن کر جو لوگ تعزیت کے لیے آئے' ان میں خواجہ ناظم الدین سرفہرست تھے' جنہیں مسٹر غلام محمد نے وزیراعظم کے عہدہ سے غیر آئینہ طور پر برطرف کر دیا تھا۔

گورنر جنرل کی حیثیت سے مسٹر غلام محمد کا دور پاکستان کے لیے بدشگونی کا زمانہ تھا۔ جمہوری روایات اور اقدار کی بے دریغ پامالی کا سلسلہ ان کے ہاتھوں شروع ہوا۔ اسی کے ساتھ نظام سلطنت میں "قانون ضرورت" کے عمل دخل کی ابتدا ہوئی۔ حکومت میں شخصیت پرستی نے فروغ پایا۔ مشرقی پاکستان کی سیاست نے واضح طور پر ایک الگ رخ اختیار کیا' لیکن مرکزی قیادت نوکر شاہی کے پٹے پٹائے نوآبادیاتی فارمولوں میں پابجولاں رہی۔ بری افواج کے کمانڈر انچیف نے اپنے عہدہ کے ساتھ وزیر دفاع کی خدمت شامل کر کے کابینہ میں شرکت حاصل کی اور اس طرح حکومت کے اندرونی کاروبار کی ٹریننگ حاصل

For more books visit www.4Urdu.com

کر کے مستقبل کے لیے اپنے عزائم کو پختہ کر لیا۔ اس دور کی مجموعی خصوصیت بے ثباتی' بے یقینی' بے اعتمادی اور بدنیتی تھی۔

URDU4U.COM

مجھ سے کئی بار یہ سوال کیا گیا ہے کہ مسٹر غلام محمد اس قدر شدید بیمار تھے کہ وہ چل پھر نہ سکتے تھے۔ بول نہ سکتے تھے' زیادہ لکھ پڑھ نہ سکتے تھے' لیکن اس کے باوجود وہ بڑے رعب داب سے حکمرانی کرتے رہے۔ ان کی طاقت کا اصلی راز کیا تھا؟

اس سوال کے دو جواب ہیں۔ ایک جواب یہ ہے کہ مسٹر غلام محمد کی طاقت کا سرچشمہ سیاست دانوں کی کمزوری تھی۔

اس کے علاوہ دوسرا جواب یہ بھی ہے کہ جنرل اسکندر مرزا کی شہہ پر مسٹر غلام محمد کو کمانڈر انچیف ایوب خاں کی پشت پناہی بھی حاصل تھی' جو نظر نہ آنے والی روشنائی سے لکھی ہوئی تھی! مستقبل کے بارے میں ان دونوں حضرات کے اپنے اپنے عزائم تھے' جو مسٹر غلام محمد کی طرز کے گورنر جنرل کی اوٹ لیے بغیر پروان نہ چڑھ سکتے تھے۔

○○○

For more books visit www.4Urdu.com

## • سکندر مرزا کا عروج و زوال

اگست ۱۹۵۵ء میں میجر جنرل اسکندر مرزا نے گورنر جنرل کا عہدہ سنبھالا اور دستور کے مطابق اسی روز میں نے چارج چھوڑنے کی رپورٹ مکمل کر کے ان کی خدمت میں بھیج دی' تا کہ وہ اپنی پسند کا نیا سیکرٹری منتخب کر لیں۔ وہ یہ رپورٹ ہاتھ میں لیے میرے کمرے میں آئے' اور کہا' "میری خواہش ہے کہ تم اسی جگہ کام کرتے رہو۔"

شروع شروع میں ان کے ساتھ کام کرنے میں ایک عجیب دقت پیش آئی۔ اب تک ہم لوگ گورنر جنرل کی گفتگو آواز سن کر نہیں بلکہ ہونٹوں کی حرکت دیکھ کر سمجھنے کی کوشش کیا کرتے تھے۔ اب معاملہ اس کے برعکس تھا۔ دو تین بار ایسا ہوا کہ جیسے ہی نیا گورنر جنرل کوئی بات شروع کرتا' میں غیر ارادی طور پر ٹکٹکی باندھ کر ان کے ہونٹوں کی طرف دیکھنا شروع کر دیتا۔ وہ سمجھتے کہ شاید ان کے منہ پر کوئی چیز چپکی ہوئی ہے۔ وہ فوراً اپنا رومال نکال کر منہ صاف کرنا شروع کر دیتے۔ جب کئی بار یہی واقعہ پیش آیا تو میں نے انہیں بڑی صاف دلی سے صحیح صورتحال سے آگاہ کر دیا۔ یہ سن کر وہ بہت ہنسے اور بولے---- "کوئی بات نہیں۔ آہستہ آہستہ تمہیں نارمل آواز سننے کی عادت بھی پڑ جائے گی۔"

بیگم ناہید مرزا کے آنے سے گورنر جنرل ہاؤس کی کایا ہی پلٹ گئی۔ وہ بڑی سلیقہ مند اور نفاست پسند ایرانی خاتون تھیں' اور انہیں گھر بار کی آرائش و زیبائش اور زینت و سجاوٹ بے حد شوق تھا۔ ایک روز وہ میرے دفتر کے کمرے میں تشریف لائیں اور پوچھنے لگیں' "تمہیں اپنے کمرے کی نئی تزئین و ترتیب پسند آئی؟"

میں نے حیرت سے ادھر ادھر دیکھا' تو وہ بڑے تعجب سے بولیں۔ "کیا سچ مچ تمہیں اس کمرے میں کوئی تبدیلی نظر نہیں آئی؟"

For more books visit www.4Urdu.com

میں بڑی ندامت سے سر کھجانے لگا' کیونکہ میں واقعی اپنے کمرے میں کوئی نیا پن نوٹس نہ کیا تھا۔ بیگم مرزا نے مایوسی سے اپنی پیشانی پر ہاتھ مارا اور کہنے لگیں۔ "ذرا غور سے دیکھو------ پرانے فرسودہ پردوں کی جگہ کتنے خوبصورت نئے پردے لگائے گئے ہیں۔ صوفوں کے کشن بھی پردوں کے ہم رنگ ہیں۔ دروازے کے دونوں طرف کھلے ہوئے پھولوں کے گملے ہیں۔ کھڑکی میں بھی تازہ پھولوں کا گلدان ہے اور تمہارا میلا سا کوٹ جو کھونٹی پر ٹنگا رہتا تھا' اب ڈرائی کلین کر کے پلاسٹک کے کور میں لٹکایا ہوا ہے۔"

میں شرمندہ ہو کر بدذوقی کی معافی مانگنے لگا تو وہ مسکرا کر بولیں۔ "یہ جرم قبل عفو تو نہیں۔ لیکن ایک کام کرو تو معافی مل سکتی ہے۔"

"آپ حکم دیجئے۔ میں ہر طرح حاضر ہوں۔"

"مس بورل کو فوراً یہاں سے چلتا کرو۔" بیگم مرزا نے سنجیدگی سے کہا۔

اس غیر متوقع فرمائش پر میں کسی قدر حیران ہوا' تو وہ بولیں۔ "حیران ہونے کی کوئی ضرورت نہیں۔ کامن سنس کی بات ہے۔ جتنی دیر وہ یہاں رہے گی۔ اتنے ہی زیادہ اسکینڈل بننے کا چانس ہے۔ تم اس دفتر کے انچارج ہو۔ جلد سے جلد اسے فارغ کر دو۔ لیکن میرا نام بیچ میں نہ آئے۔"

مس روتھ بورل غیر معمولی طور پر حساس اور دور اندیش لڑکی تھی۔ گورنر جنرل ہاؤس میں تبدیلیاں رونما ہوتے ہی عورت کی چھٹی حس نے خبردار کر دیا تھا کہ اب اس کا یہاں گزارا ہونا مشکل ہے۔ چنانچہ میرے ہلکے سے اشارے پر اس نے اپنا استعفیٰ دے دیا اور چند روز بعد اپنی والدہ کو لے کر پاکستان سے رخصت ہو گئی۔

میجر جنرل اسکندر مرزا اور بیگم مرزا کے آتے ہی گورنر جنرل ہاؤس میں دعوتوں اور پارٹیوں کا دور شروع ہو گیا۔ کبھی ڈنر' کبھی ڈانس' کبھی مون لائٹ پکنک------ وقتہ فوقتہ نئی نئی تقریبات منعقد ہوتی رہتی تھیں' جو آٹھ ساڑھے آٹھ بجے شروع ہو کر رات کے ڈیڑھ دو بجے تک چلتی تھیں۔ عورتوں کے لیے تو یہ ایک طرح کی فیشن پریڈ ہوتی تھی'

For more books visit www.4Urdu.com

جس میں وہ اپنے حسن و جمال کے علاوہ قسم قسم کے ملبوسات کی نمائش کیا کرتی تھیں۔ کچھ خواتین ایسا لباس پہننے میں مہارت رکھتی تھیں جو جسم کو چھپانے کی بجائے اسے فنکاری سے عریاں کرنے میں مدد دیتا تھا۔ ان پارٹیوں میں شامل ہونے والے کئی زندہ دل لوگ ایسی خواتین کے کندھوں اور کولہوں پر ہاتھ پھیر پھیر کر ان کے لباس کے میٹریل کی دیر دیر تک تعریف کرتے رہتے تھے------ اگرچہ ان کے کندھوں اور کولہوں پر دور دور تک کسی لباس کا کوئی میٹریل موجود نہ ہوتا تھا۔ ساغر و مینا کی کرامات بھی اپنا رنگ جماتی تھیں اور بیگم مرزا کی نگرانی میں تیار کئے ہوئے ایرانی پلاؤ اور کباب اور کوفتے بڑے لاجواب ہوتے تھے۔ ان محفلوں میں جو لوگ صاحب اقتدار ہوتے تھے' وہ دولت مند تاجروں اور صنعت کاروں کی طرف بصد حسرت و یاس تکتے تھے۔ جن کے پاس دولت کی فروانی تھی' ان کو اقتدار والوں پر رشک آتا تھا اور جن کے پاس دولت اور اقتدار دونوں نعمتیں تھیں' ان کی دلچسپی کا واحد مرکز عورت ذات تھی۔ کثرت مے نوشی کے بعد کچھ لوگ کھانے پر گدھ کی طرح گرتے تھے اور اس طرح بدحواس ہو کر کھاتے تھے۔ جیسے چوپائے کھاتے ہیں۔ کچھ لوگ کھانے پینے سے بے نیاز ہو کر سکتے کے عالم میں آ جاتے تھے اور غنودگی کی حالت میں گم سم بیٹھ جاتے تھے۔ بعض لوگ غسلخانوں میں جا کر بار بار قے کرتے تھے اور تازہ دم ہو کر ازسر نو شراب ناب کا دور شروع کر دیتے تھے۔ لہو و لعب کے ان مشغلوں میں انسانیت سسک سسک کر دم توڑ دیتی تھی اور بہیمت نت نئے روپ دھارتی رہتی تھی۔ البتہ میجر جنرل اسکندر مرزا شراب پی کر خود کبھی بدمست نہ ہوتے تھے۔ وہ گلاس ہاتھ میں لیے اپنی مہمانوں میں منڈلاتے رہتے تھے اور ان کی بدحواسیوں' کم ظرفیوں اور مدہوشیوں کا خوب مزا لیتے تھے۔ ایک روز وہ ایک خوبصورت خاتون کا پلو پکڑے اس کی ساڑھی کی تعریف کر رہے تھے۔ بیگم مرزا چیل کی طرح جھپٹ کر آئیں اور اس عورت کو ڈانٹا کہ وہ ان کے میاں کے ساتھ فلرٹ کرنے کی کوشش نہ کرے۔ عورت نے احتجاج کیا کہ وہ تو صرف اس

For more books visit www.4Urdu.com

کی ساڑی کی تعریف کر رہے تھے۔ اس پر بیگم مرزا نے کہا۔ میرے ساتھ تعلقات کی ابتدا بھی انہوں نے اسی طرح کی تھی۔" بیگم ناہید مرزا اسکندر مرزا صاحب کی دوسری بیوی تھیں۔ پہلے وہ پاکستان میں ایران کے ملٹری اٹیچی کے ساتھ بیاہی ہوئی تھیں۔ پھر اس سے طلاق حاصل کر کے انہوں نے اسکندر مرزا سے شادی کر لی۔ اس وقت وہ ڈیفنس سیکرٹری تھے۔

گورنر جنرل کی ان پارٹیوں میں مجھے صرف ایک بار شمولیت کا موقع ملا۔ پارٹی کے رنگ سے مجھے بڑ بدمزگی اور کراہت محسوس ہوئی۔ دوسری بات جب مجھے اسی قسم کی دعوت ملی تو میں نے بیگم مرزا کو فارسی کا یہ شعر لکھ کر بھیج دیا:

در محفل خود راہ مدہ ہمچومنے را
افسردہ دل افسردہ کند انجمنے را

اس کے بعد انہوں نے سرکاری تقریبات کے علاوہ مجھے اپنی کسی اور دعوت میں شرکت کے لیے مدعو نہ کیا۔

میجر جنرل اسکندر مرزا کے کام کرنے کا طریقہ بڑا منظم تھا۔ وہ صبح آٹھ بجے سے دوپہر کے ایک بجے تک جم کر دفتر میں بیٹھتے تھے۔ روز کی فائلیں روز ہی نپٹا دیتے تھے۔ اس کے بعد شام کے وقت انہوں نے مجھے کبھی سرکاری کام کے لیے طلب نہیں کیا۔ سیاسی میل ملاپ اور جوڑ توڑ کا سارا کام وہ دفتری اوقات کے بعد کرتے تھے۔ ان کی ملازمت کا بیشتر حصہ برٹش دور کی پولیٹیکل سروس میں گزرا تھا' اس لیے اس کام میں انہیں خصوصی مہارت حاصل تھی۔ میرے کمرے کی ایک کھڑکی گورنر جنرل ہاؤس کے برآمدے میں کھلتی تھی۔ ایک بجے جب وہ دفتر سے اٹھ کر اس برآمدے سے گزرتے تھے تو لمحہ بھر کے لیے کھڑکی کے پاس کھڑے ہو کر پوچھ لیتے تھے کہ کوئی اہم کام باقی

For more books visit www.4Urdu.com

تو نہیں رہ گیا؟ اس کے بعد میرا اور ان کا رابطہ اگلی صبح تک کے لیے ٹوٹ جاتا تھا۔
اس لائحہ عمل میں فقط ایک بار تبدیلی آئی۔ ایک روز میں اپنے گھر پر تھا کہ رات
URDU4U.COM
کے دس بجے گورنر جنرل ہاؤس کی کار آئی اور اس میں سے کراچی کے ایک بہت بڑے
سیٹھ نمودار ہوئے۔ وہ شراب کے نشے میں دھت تھے۔ انہوں نے مجھے گورنر جنرل کے
ہاتھ کا لکھا ہوا ایک پرچہ دیا جس میں میرے نام حکم تھا کہ میں ان صاحب کو چیف
کنٹرولر آف امپورٹ ایکسپورٹ سے پچیس شیورلٹ کاریں درآمد کرنے کا لائسنس فورا دلوا
دوں۔ اسکندر مرزا کے دستخط کے نیچے اس روز کی تاریخ تھی اور تاریخ کے نیچے یہ حکم
نامہ تحریر کرنے کا وقت "9 P.M." بھی درج تھا۔ سیٹھ صاحب نے کہا کہ گورنر جنرل
نے مجھے بھی اپنے پاس بلایا ہے۔ میں ان کی خدمت میں حاضر ہوا' تو وہ مجھے ایک
الگ کمرے میں لے گئے اور کہنے لگے۔ یہ سیٹھ ساری شام ہاتھ دھو کر میرے پیچھے
پڑا رہا۔ میں نے بھی جان بچانے کے لیے یہ مضحکہ خیز نوٹ لکھ دیا۔ اس کے نیچے وقت
اس لیے درج کیا ہے تاکہ تم سمجھ جاؤ کہ یہ دفتر کی بات نہیں بلکہ محفل ناؤ نوش
کا حکم ہے۔ اب تم اس سیٹھ کو اپنے دفتر میں لے جا کر ڈانٹو ڈپٹو' اور یہ حکمنامہ
اس کے سامنے پھاڑ کر ردی کی ٹوکری میں پھینک دو۔ آئندہ بھی اگر کوئی ایسی تحریر
لائے جس پر شام کے آٹھ بجے کے بعد کا وقت درج ہو تو اسے بھی بغیر کسی ہچکچاہٹ
کے پھاڑ کر پھینک دو۔"

اسکندر مرزا صاحب کو گورنر جنرل بنے تین روز ہوئے تھے کہ شام کے پانچ بجے مجھے
گھر پر مسٹر سہروردی نے ٹیلیفون کر کے پوچھا۔ "پرائم منسٹر کے طور پر میرا حلف لینے
کے لیے کون سی تاریخ مقرر ہوئی ہے؟"

یہ سوال سن کر مجھے بڑا تعجب ہوا' کیونکہ مجھے اس کے متعلق کچھ بھی معلوم نہ تھا۔
میں نے یہی بات ان کو بتائی' تو مسٹر سہروردی غصے سے بولے۔ "تم کس طرح کے نکمے
سیکرٹری ہو۔ فیصلہ ہو چکا ہے۔ اب صرف تفصیلات کا انتظار ہے۔ فوراً گورنر جنرل کے

For more books visit www.4Urdu.com

پاس جاؤ' اور حلف اٹھانے کی تاریخ اور وقت معلوم کر کے مجھے خبر دو۔ میں انتظار کروں گا۔"

مجبوراً میں اسکندر مرزا صاحب کے پاس گیا۔ وہ اپنے چند دوستوں کے ساتھ برج کھیل رہے تھے۔ موقع پا کر میں انہیں کمرے سے باہر لے گیا اور انہیں مسٹر سہروردی والی بات بتائی۔ یہ سن کر وہ خوب ہنسے اور اندر جا کر اپنے دوستوں سے بولے۔ "تم نے کچھ سنا؟ سہروردی وزیراعظم کا حلف لینے کا وقت پوچھ رہا ہے۔ اس پر سب نے تاش کے پتے زور زور سے میز پر مارے' اور بڑے اونچے فرمائشی قہقہے بلند کئے۔ کچھ دیر اچھی خاصی ہڑبونگ جاری رہی۔ اس کے بعد گورنر جنرل نے مجھے کہا۔ "میری طرف سے تمہیں اجازت ہے کہ تم سہروردی کو بتا دو کہ حلف برداری کی رسم پرسوں منعقد ہو گی اور چوہدری محمد علی وزیراعظم کا حلف اٹھائیں گے۔"

وہاں سے میں سیدھا مسٹر سہروردی صاحب کے ہاں پہنچا اور ان کو یہ خبر سنائی۔ ایسا دکھائی دیتا تھا کہ ان کے ساتھ کچھ وعدے وعید ہو چکے تھے۔ اس نئی صورت حال پر وہ بڑے جھلائے اور میرے سامنے انہوں نے بس اتنا کہا۔ "اچھا' پھر وہی محلاتی سازش۔"

دو روز بعد ۱۱ اگست ۱۹۵۵ء کو چوہدری محمد علی نے وزارت عظمٰی کا حلف اٹھا لیا۔ ان کی حکومت مسلم لیگ اور یونائیٹڈ فرنٹ کی کولیشن سے بنی تھی۔ "شیر بنگال" مولوی اے۔ کے فضل الحق پہلی بار کسی مرکزی کابینہ میں شامل ہوئے اور انہیں وزارت داخلہ ملی۔ کچھ عرصہ قبل ان پر بڑے زور شور سے "غدار" اور "ملک دشمن" کا الزام لگ چکا تھا۔ لیکن اب وہی "غدار" اور "ملک دشمن" پاکستان کا وزیر داخلہ تھا۔ بدقسمتی سے کبھی کبھی ہماری سرکاری' سیاسی' سماجی اور ذاتی قوت برداشت بڑی ضعیف ثابت ہوتی ہے۔ حکومت وقت کے ساتھ اختلاف غداری بن جاتا ہے اور سیاسی سماجی امور میں رائے کا تصادم وطن دشمنی قرار پا سکتا ہے۔ اس فعل عبث میں حب الوطنی کی ساکھ کے علاوہ اور کسی کا کچھ نہیں بگڑتا۔

اس کابینہ میں ایک نیا چہرہ سید عابد حسین کا تھا۔ وہ ضلع جھنگ میں شاہ جیونہ کے بہت

For more books visit www.4Urdu.com

بڑے زمیندار تھے اور بڑی خوبصورت' خوب سیرت' روشن خیال اور خوش اخلاق شخصیت کے حامل تھے۔ ان کے کردار میں میانہ روی' حیا داری اور راست بازی کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی اور ان کی گفتگو سادہ اور پرکشش ہوتی تھی۔ وہ ان معدودے چند لوگوں میں سے تھے جو دولت مند تو تھے' لیکن دولت کی ریل پیل نے ان کے اخلاق میں کوئی کجی پیدا نہ کی تھی۔ جسمانی طور پر وہ صحت مندی کا قابل رشک نمونہ تھے اور ہر طرح کا لباس ان پر خوب پھبتا تھا۔ افسوس کہ انہوں نے زیادہ عمر نہ پائی۔ اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے۔

چوہدری محمد علی کے وزیراعظم مقرر ہونے کے بعد دو ماہ کے عرصہ میں مغربی پاکستان "ون یونٹ" بنانے کا کام مکمل ہو گیا۔ اس منصوبے کی بنیاد تو اسی وقت پڑ چکی تھی' جب مارچ ۱۹۵۰ء میں مسٹر غلام محمد نے ویسٹ پاکستان (اسٹیبلشمنٹ) آرڈر جاری کر کے نواب مشتاق احمد گورمانی کو مجوزہ صوبے کا گورنر اور ڈاکٹر خان صاحب کو چیف منسٹر نامزد کر دیا تھا لیکن اس قانون کا بل اسمبلی نے ۳۰ ستمبر کو پاس کیا اور ۱۴ اکتوبر ۱۹۵۵ء کو مغربی پاکستان کا صوبہ باضابطہ طور پر معرض وجود میں آ گیا۔

انتظامی لحاظ سے یہ بڑا معقول اور قابل عمل منصوبہ تھا لیکن اسے سیاسی اکھاڑے میں اتارا گیا تو اس کا حلیہ بگڑ کے رہ گیا۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ اس منصوبہ کو عملی جامہ پہنانے کے لیے زور شور سے اس وقت کام شروع ہوا جب ۱۹۵۴ء میں مشرقی پاکستان میں مسلم لیگ کو بری طرح شکست ہو چکی تھی۔ اسی وقت سے کچھ لوگوں نے یہ کہنا شروع کر دیا تھا کہ اب یہ خطرہ لاحق ہو گیا ہے کہ مغربی پاکستان کے چھوٹے صوبے مشرقی پاکستان کی نئی سیاسی پارٹیوں کے ساتھ گٹھ جوڑ کر کے مرکزی قیادت پر قبضہ حاصل کر لیں۔ ایسی ذہنیت کے لوگوں کے نزدیک "ون یونٹ" اس قسم کے "خطرات" کو روکنے کا موثر ذریعہ تھا۔

دوسری بات یہ ہے کہ پنجاب کا صوبہ اپنی آبادی' تعلیم اور ترقی کی وجہ سے ہمیشہ دوسرے صوبوں سے آگے رہا ہے۔ اس وجہ سے بین الصوبائی رقابتوں اور تعصبات نے بڑا فروغ

For more books visit www.4Urdu.com

پایا اور پنجاب کے خلاف چھوٹے صوبوں میں کچھ صحیح اور کچھ غلط اور فرضی شکایات اور الزامات کے دفتر کھل گئے۔ "ون یونٹ" کے منصوبے میں بھی چھوٹے صوبوں کو پنجاب کی بالادستی کی سازش نظر آنے لگی اور ان کو شبہ ہو گیا کہ اس سکیم کے ذریعہ پنجاب ان کے نظم و نسق پر بھی براہ راست قبضہ جمانا چاہتا ہے۔

تیسری بات یہ ہے کہ کچھ سیاست دانوں نے "ون یونٹ" کے خلاف کھلم کھلا محاذ قائم کر کے اس کی مخالفت میں ایک منظم تحریک چلانی شروع کر دی۔ اس میں خان عبدالغفار خان' پیر صاحب مانکی شریف' جی۔ ایم۔ سید' شیخ عبدالمجید اور سردار صمد خاں اچکزائی پیش پیش تھے۔

چوتھی بات یہ ہے کہ مسلم لیگ کے علاوہ اور کسی سیاسی پارٹی کا رویہ "ون یونٹ" کے حق میں واضح طور پر مثبت نہ تھا بلکہ اس بارے میں کئی چوٹی کے سیاست دانوں کا کردار حیرتناک حد تک متضاد اور متناقض تھا۔ صوبہ سرحد کے وزیر اعلیٰ سردار عبدالرشید پہلے "ون یونٹ" کے حق میں تھے' لیکن پھر اچانک اس کے برخلاف ہو گئے۔ اس کی پاداش میں ان کی وزارت برطرف کر دی گئی۔ پنجاب کے وزیر اعلیٰ ملک فیروز خاں نون بھی پہلے ون "یونٹ" کے حمایتی تھے لیکن پھر مخالف ہو گئے۔ نتیجتاً ان کو بھی وزارت سے ہاتھ دھونا پڑا۔ سندھ کے پیر علی محمد راشدی کا شمار بھی "ون یونٹ" کے حمایتیوں میں ہوتا تھا لیکن وہ بھی پینترا بدل کر اس سکیم کے مخالفین کی صف میں جا کھڑے ہوئے۔

لیکن اس سلسلے میں سب سے بڑی قلابازی مسٹر سہروردی نے کھائی تھی۔ مسٹر غلام محمد کے زمانے میں جب وہ وزیر قانون تھے' تو "ون یونٹ" قائم کرنے کا گورنر جرنیلی آرڈر انہی کی نگرانی میں تیار ہو کر جاری ہوا تھا۔ صرف چھ ماہ بعد جب یہی آرڈر بل کی صورت میں اسمبلی کے سامنے آیا تو مسٹر سہروردی نے اس کی ڈٹ کر مخالفت کی۔ کیا اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ اب کابینہ کے رکن نہ رہے تھے؟ یا شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ وہ وزارت عظمیٰ حاصل کرنے میں ناکام ہو گئے تھے۔ سیاست دانوں کی اس

For more books visit www.4Urdu.com

آنکھ مچولی سے صاف ظاہر ہے کہ ان میں سے کسی کی نظر "ون یونٹ" کے قومی اور انتظامی فوائد اور خوبیوں کی جانب نہ تھی۔ اس منصوبے کے متعلق اپنی رائے قائم کرنے میں وہ فقط اپنا ذاتی اور وقتی مفاد پیش نظر رکھتے تھے۔

URDU4U.COM

پانچویں بات یہ ہے کہ "ون یونٹ" بنتے ہی چھوٹے صوبوں کی گورنریاں' وزارتیں اور اسمبلیاں ٹوٹ گئیں اور ان سطحوں کے سارے اختیارات لاہور منتقل ہو گئے۔ نظم و نسق میں Decentralization کا ایسا کوئی طریقہ رائج نہ کیا گیا جس کے ذریعہ مقامی معاملات مقامی طور پر ہی طے پاتے رہیں۔ یوں بھی بیوروکریشی کا روایتی مزاج ایسا ہے کہ جو طاقت ایک بار اس کے ہاتھ میں آ جائے اسے واپس کر کے دوسروں میں تقسیم کرنا اس پر بڑا شاق گزرتا ہے۔ چنانچہ اب صورت حال یہ ہو گئی کہ بلوچستان' سندھ اور سرحد کے لوگوں کو دور دراز کا سفر اختیار کر کے اپنے بعض چھوٹے چھوٹے کاموں کے لیے بھی لاہور آنا پڑتا تھا۔ اس میں بڑی دشواریوں' پریشانیوں اور تکالیف کا سامنا تھا۔ اس نے بھی بہت سے عناصر کے ذہن میں "ون یونٹ" کی افادیت کی مشکوک بنا دیا۔

چھٹی بات یہ ہے کہ صوبائی سطح کے سرکاری ملازمین کو یہ فکر دامن گیر ہو گئی کہ "ون یونٹ" بننے کے بعد شاید ان کے تبادلے بھی مغربی پاکستان کے دور دراز علاقوں میں ہونا شروع ہو جائیں۔ تبادلوں کا یہ خوف شمشیر برہنہ کی طرح ان کے ذہن پر لٹک گیا اور اس طرح سرکاری ملازمین کی ایک کثیر تعداد کے دل میں "ون یونٹ" کے خلاف بدظنی نے راہ بنائی۔

ساتویں بات یہ ہے کہ ہر صوبے میں ایسے سیاست پسند لوگوں کی خاصی بڑی تعداد ہوتی ہے جو خود تو انتخاب نہیں لڑتے لیکن مقامی سیاست میں کئی طریقوں سے سرگرم عمل رہتے ہیں۔ جب چھوٹے صوبوں کی اپنی اپنی اسمبلیاں نہ رہیں تو یہ میدان خالی ہو گیا اور عملی طور پر فعال لوگوں کی کثیر تعداد احساس محرومی کا شکار ہو گئی۔

نتیجہ یہ ہوا کہ سیاست دانوں کی محاذ آرائیوں' خود غرضیوں اور قلابازیوں' بیروکریسی کی بے تدبیریوں اور کوتاہ اندیشیوں' بعض سرکاری ملازمین کی بدظنیوں اور عوام کے ایک

For more books visit www.4Urdu.com

بڑے طبقہ کی دشواریوں اور محرومیوں کی وجہ سے "ون یونٹ" کا انتظامی تجربہ کامیابی سے ہمکنار نہ ہو سکا۔

وزیراعظم کے طور پر چوہدری محمد علی کا سب سے بڑا کارنامہ ۱۹۵۷ء کے آئین کے نفاذ کا تھا۔ پچھلے نو برس میں خان لیاقت علی خاں سے لے کر اب تک کسی وزیراعظم نے آئین سازی کے کام کو آگے نہ بڑھایا تھا۔ چوہدری محمد علی نے وزیراعظم کا عہدہ سنبھالنے کے بعد پانچ ماہ کے اندر آئین کا مسودہ شائع کر دیا۔ جب یہ مسودہ آئین ساز اسمبلی میں پیش ہوا تو اس کی ۲۴۵ دفعات کے لیے ۶۷۰ ترامیم پیش ہوئیں۔ خاص طور پر مشرقی پاکستانی میں بڑا طوفان اٹھا۔ وہاں پر "Resistance Day" بھی منایا گیا' جس میں جلسے ہوئے' جلوس نکلے اور ہڑتال ہوئی۔ مولوی اے' کے فضل الحق نے بڑی سخت تقریریں کیں۔ مولانا بھاشانی نے تو مشرقی پاکستان کو الگ کرنے تک کی دھمکی دے دی۔ اسمبلی کے اندر عوامی لیگ کے ایک لیڈر مسٹر ابومنصور نے یہاں تک کہہ دیا کہ مشرقی اور مغربی پاکستان کا ایک مذہب ہے اور دونوں نے ایک ہی تحریک کے ذریعے آزادی حاصل کی ہے۔ اس کے علاوہ ان دونوں حصوں میں کوئی قدر مشترک نہیں۔ دونوں حصے الگ الگ ملک اور الگ الگ قومیں ہیں۔ مسٹر سہروردی نے بھی آئین کی خوب مخالفت کی اور جب رائے شماری کا وقت آیا تو اسمبلی سے واک آؤٹ کر گئے۔ کچھ عرصہ بعد جب یہی سہروردی اسی آئین کے تحت وزیراعظم بنے' تو انہوں نے بلا کسی جھجک کے یہ اعلان کر دیا کہ اس آئین میں مشرقی پاکستان کے اٹھانوے فیصد مطالبات پورے ہو گئے ہیں۔

آئین کے خلاف اس تمام محاذ آرائی' مخالفت اور مخاصمت کا سامنا چوہدری محمد علی نے بڑے تحمل' بردباری اور مدبرانہ دانشمندی سے کیا۔ ان کی کوششیں بار آور ہوئیں اور ۲۳ مارچ ۱۹۵۶ء کو پاکستان کا پہلا آئین نافذ ہو کر اسلامیہ جمہوریہ پاکستان کا قیام عمل میں آیا۔ نئے آئین کے تحت چوہدری محمد علی کے وزیراعظم نے طور پر حلف اٹھایا اور میجر جنرل

For more books visit www.4Urdu.com

اسکندر مرزا ملک کے پہلے صدر مقرر ہوئے۔

۲۳ مارچ ۱۹۵۶ء کو جب ایوان صدر میں نیا آئین نافذ کرنے کی تقریب منعقد ہو رہی تھی' تو اس دوران دو بدشگونیاں ظہور میں آئیں۔ تقریب شروع ہونے سے کچھ دیر پہلے بڑے زور کی آندھی آئی اور تیز بارش ہوئی جس سے شامیانے کا کچھ حصہ چند مہمانوں کے اوپر گر گیا' جن میں اسمبلی کے سپیکر مولوی عبدالوہاب خاں بھی شامل تھے۔ اس علامت سے شاید فطرت کے عناصر نے یہ پیشگوئی کر دی تھی' کہ اٹھارہ ماہ بعد اس آئین کا بھی کچھ ایسا ہی حشر ہونے والا ہے۔ دوسری بدشگونی صدر کے طور پر میجر جنرل اسکندر مرزا کا تقرر تھا۔ نیا آئین اسلامی اور جمہوری اقدار کا حامل تھا۔ لیکن ملک کے پہلے صدر کو ان دونوں اقدار سے دور کا بھی کوئی واسطہ نہ تھا۔ نئے آئین کو اسکندر مرزا کی صدارت میں چلانا ویسا ہی تھا جیسے کہ دودھ کو بلی کی رکھوالی میں رکھنا۔

اسکندر مرزا صاحب جوڑ توڑ کے بادشاہ تھے۔ گورنر جنرل یا صدر کے طور پر آئینی بندشوں اور پابندیوں میں مقید ہو کے رہنا ان کے لیے ناممکن تھا۔ جب ان کے دوست ڈاکٹر خان صاحب مغربی پاکستان کے وزیر اعلیٰ نامزد ہوئے' تو انہیں کسی سیاسی پارٹی کی حمایت حاصل نہ تھی۔ ان کی دستگیری کے لیے اسکندر مرزا صاحب نے ری پبلکن پارٹی کی داغ بیل ڈالی۔ اس پارٹی کی تشکیل گورنمنٹ ہاؤس میں براہ راست ان کی سربراہی میں ہوئی۔ جس وقت یہ پارٹی بن رہی تھی' ان دنوں اسکندر مرزا صاحب اس کام میں اس قدر منہمک تھے کہ انہیں فائلیں دیکھنے کا بھی وقت نہ ملتا تھا۔ دن میں کسی وقت وہ چند لمحوں کے لیے میرے کمرے میں آتے تھے اور کھڑے کھڑے ضروری ضروری فائلوں پر دستخط کر کے چلے جاتے تھے۔ کئی بار وہ اتنی عجلت میں ہوتے تھے کہ فائلوں کے فیتے تک نہ کھولتے تھے اور یونہی کاغذوں کو کھینچ کھانچ کر دستخط کر دیتے تھے۔

ری پبلکن پارٹی بنانے کا بھوت ان پر جس شدت سے سوار تھا ویسے ذوق شوق سے میں نے انہیں اور کوئی کام کرتے کبھی نہ دیکھا تھا۔

کچھ لوگ کہتے ہیں کہ ری پبلکن پارٹی بنانے میں مغربی پاکستان کے گورنر نواب مشتاق

For more books visit www.4Urdu.com

احمد گورمانی بھی برابر کے شریک تھے۔ کہنے والے تو یہاں تک کہتے ہیں کہ پارٹی کا منشور اور آئین بھی انہوں نے ہی مرتب کئے تھے۔ یہ الزم ری پبلکن پارٹی کے ایک سابق جنرل سیکرٹری مسٹر عبدلقیوم نے خاص طور پر لگایا ہے۔ اس کے علاوہ مسٹر گورمانی کے خلاف جب ایبڈو کے تحت انکوائری ہو رہی تھی' تو مغربی پاکستان کی اسمبلی کے سات ممبروں نے اپنی گواہی میں کہا تھا کہ ری پبلکن پارٹی صدر' وزراء اور گورنر گورمانی کے گٹھ جوڑ سے بنی تھی اور وہ اس میں گورنر کے دباؤ سے مجبور ہو کر شامل ہوئے تھے۔ ان گواہوں کے اسمائے گرامی جمیل حسین رضوی' گل نواز خان' چوہدری محمد احسن' شیخ محمد سعید' رائے نوشیر خاں' حکیم خورشید احمد اور قاضی اور مرید احمد تھے۔

ایک روز اسکندر مرزا نے مجھے قرآن مجید کا ایک نسخہ دیا کہ میں اسے احتیاط سے اپنی خفیہ کاغذات رکھنے والی الماری مقفل کر کے رکھوں اور ان کے سوا اور کسی کو نہ دکھاؤں۔ اس نسخہ میں خاص بات یہ تھی کہ سرورق کی پشت پر جو خالی صفحہ ہوتا ہے اس پر درجن بھر سیاستدانوں نے اللہ تعالیٰ کو حاضر و ناظر جان کر اور اس مقدس کتاب الٰہی کو گواہ بنا کر آپس میں تعاون کرنے کا عہد نامہ تیار کیا ہوا تھا۔ اس تحریر کے نیچے پاکستان کے بہت سے چوٹی کے لیڈروں کے دستخط تھے۔ چند ماہ کے اندر اندر یہ مقدس عہد نامہ بھی ٹوٹ پھوٹ گیا۔ افسوس کہ قرآن شریف کا وہ نادر نسخہ صدر مرزا نے مجھ سے واپس لے لیا۔ ورنہ وہ اس قابل تھا کہ عبرت حاصل کرنے کے لیے اسے ہمارے قومی عجائب گھر میں رکھا جاتا۔

ری پبلکن پارٹی کے بنتے ہی صدر اسکندر مرزا کے ہاتھ میں جادو کی چھڑی آ گئی' جسے گھما کر وہ سیاست میں جب چاہتے اپنی پسند کی تبدیلی لا سکتے تھے۔ آئین نافذ ہونے کے ۱۳ ماہ بعد چوہدری محمد علی وزیراعظم کے عہدہ سے مستعفی ہو گئے۔ ہماری تاریخ میں یہ واحد مثال ہے جس میں کسی وزیراعظم نے اپنے آپ کسی دباؤ کے بغیر اپنے عہدہ سے استعفیٰ دیا ہے۔ چوہدری محمد علی انتھک کام کرنے کے عادی تھے۔ ان کی دیانت' امانت

For more books visit www.4Urdu.com

اور منصف مزاجی کا درجہ بھی اعلیٰ تھا۔

وزارت عظمیٰ سے سبکدوشی کے بعد انہوں نے نہایت صبر اور خاموشی سے زندگی گزاری۔ ایک بار انہیں علاج کے لیے بیرون ملک جانا ضروری ہو گیا۔ لیکن وسائل کی کمی ان کے راستے میں حائل تھی۔ جب صدر اسکندر مرزا کو اس صورت حال کا علم ہوا تو انہوں نے خود ان کے ہاں جا کر کوشش کی کہ ان کے اخراجات کے لیے وہ حکومت کی مالی امداد قبول کر لیں۔ لیکن چوہدری صاحب نہ مانے۔ ان کا موقف یہ تھا کہ انہوں نے حکومت کے لیے جو خدمات سرانجام دی ہیں' ان کا انہیں پورا معاوضہ ملتا رہا ہے۔ اب وہ خواہ مخواہ پاکستان کے خزانے پر مزید بوجھ نہیں بننا چاہتے' لیکن صدر مرزا کے مسلسل اصرار پر انہوں نے بیس ہزار روپیہ قرض حسنہ کے طور پر قبول کر لیا۔ بعدازاں یہ رقم انہوں نے چند قسطوں میں واپس ادا بھی کر دی۔

اسی زمانے میں چوہدری محمد علی نے صدر مرزا کو یہ مشورہ بھی دیا تھا کہ وہ اپنا ہاتھ بٹانے کے لیے ایک وائس پریذیڈنٹ بھی رکھ لیں۔ لیکن یہ مشورہ قبول نہ کیا گیا۔ میرا اندازہ ہے کہ اگر چوہدری صاحب جیسا فہیم شخص ایوان صدر میں ڈپٹی پریذیڈنٹ کے طور پر موجود ہوتا' تو شاید ہماری تاریخ کا دھارا کوئی اور رخ اختیار کر لیتا۔ واللہ العلم۔

چوہدری صاحب کے بعد مسٹر سہروردی کی دیرینہ آرزو پوری ہوئی اور وہ وزیراعظم بنے۔ ان کی حکومت ری پبلکن پارٹی اور عوامی لیگ کے اشتراک سے بنی تھی۔ تیرہ ماہ بعد ری پبلکن پارٹی نے ان کا ساتھ بھی چھوڑ دیا اور صدر مرزا نے ان کا استعفیٰ طلب کر لیا۔

آخر میں چھ سیاسی پارٹیوں کی کولیشن سے ملک فیروز خاں نون نے وزیراعظم کا عہدہ سنبھالا اور نو ماہ کے قریب حکومت کی۔ ان کے زمانے میں کبھی کبھی ایسی نوبت بھی آ جاتی تھی کہ وزیروں کی فوج ظفر موج وزارتوں کی تعداد سے کہیں آگے نکل جاتی تھی۔ حلف لینے والے وزیروں کو معلوم ہوتا تھا کہ ان کی وزارت کی چاندنی چند ماہ سے زیادہ

For more books visit www.4Urdu.com

نہ چمکے گی۔ اس لیے محکموں کی تقسیم پر بڑا فساد ہوتا تھا۔ اس زمانے میں "خشک" اور "تر" وزارتوں کی اصطلاح بڑی فراوانی سے استعمال ہوا کرتی تھی۔ وزارت خزانہ' تجارت' صنعت' ورکس' خوراک وغیرہ کا شمار "تر" وزارتوں میں ہوتا تھا۔ ایک بار ایک کابینہ نامزد تو ہو گئی لیکن کئی روز تک حلف نہ اٹھا سکی کیونکہ محکموں کی بندر بانٹ کا قضیہ کسی طور طے نہ پاتا تھا۔ آخر خدا خدا کر کے یہ مسئلہ بھی طے ہوا' اور جب سب لوگ حلف اٹھانے کے لیے ایوان صدر میں جمع ہوئے تو اچانک یہ معلوم ہوا کہ رپورٹ فولیوز کی تقسیم کے دوران وزارت تعلیم پر کسی کی نظر انتخاب نہ پڑی تھی:

آئین نافذ ہونے کے بعد تین سال کے عرصہ میں چار مرکزی حکومتیں اقتدار میں آئیں جن میں گیارہ سیاسی پارٹیوں نے حصہ لیا۔ ری پبلکن پارٹی ان سب میں شامل تھی۔ اس صورت حال کے رونما ہونے پر صدر اسکندر مرزا کے جوڑ توڑ کا بڑا عمل دخل تھا۔ وہ تین باتیں ثابت کرنا چاہتے تھے۔ اول یہ' کہ نیا آئین قابل عمل نہیں۔ دوئم یہ' کہ ملک بھر میں ایک بھی ایسی سیاسی شخصیت موجود نہیں جو مستحکم حکومت بنا کر اسے خوش اسلوبی سے چلا سکے' اور سوئم یہ کہ عملی سیاست میں کوئی ایسی جماعت نہیں جو ملک کے دونوں حصوں کا اعتماد حاصل کر کے حکومت کا کاروبار سنبھال سکے۔ تین سال کے عرصہ میں انہوں نے اپنا یہ مقصد بڑی حد تک حاصل کر لیا کیونکہ اس عرصہ میں ملک کی تقریباً سب بڑی بڑی سیاسی پارٹیاں اور اہم لیڈر یکے بعد دیگرے حکومت میں شامل ہو کر یا ناکام ہو چکے تھے یا ناکام کر دیئے گئے تھے۔

اس میں کوئی شک و شبہ کی گنجائش نہیں کہ صدر اسکندر مرزا جمہوریت سے خوفزدہ تھے اور اسے ناکام ثابت کر کے اپنی شخصی آمریت کا تسلط جمانا چاہتے تھے۔ وہ شاہانہ ٹھاٹھ باٹھ کے رسیا تھے اور بادشاہوں کے طور طریقوں کو دیکھ کر بے حد مرعوب ہو جاتے تھے۔ ایک بار وہ افغانستان کے سرکاری دورے پر گئے۔ ظاہر شاہ محض نام کا بادشاہ تھا۔ وہاں پر اصلی حکومت اس کے چچاؤں کی تھی۔ سردار داؤد وزیراعظم تھے اور اسی وقت

For more books visit www.4Urdu.com

سے درپردہ روس کے ساتھ پینگیں بڑھانے میں لگے ہوئے تھے۔ ملک میں غربت' افلاس اور پسماندگی کا دور دورہ تھا۔ لیکن شاہی محلات میں طاؤس و رباب اور کباب و شباب کا زور تھا۔ بادشاہ کی سرکاری دعوت میں جو مینو کارڈز میز پر سجائے ہوئے تھے' ان کے ایک طرف انگریزی طرز کے کھانوں کے نام تھے اور دوسری طرف افغانی کھانوں کی فہرست تھی۔ میرا خیال تھا کہ ہر مہمان کی پسند کے مطابق اسے انگریزی یا افغانی کھانے کھلائے جائیں گے۔ لیکن ہوا یہ کہ پہلے سب کے لیے چھ کورس کے انگریزی کھانوں کا دور چلا۔ اس کے بعد آٹھ دس قسم کے مرغن افغانی کھانے میز پر آئے۔ کچھ لوگوں نے دونوں قسم کے کھانوں کے ساتھ بڑی بے تکلفی سے پورا پورا انصاف کیا۔ کھانے کے بعد بادشاہ سلامت سب مہمانوں کو ساتھ لے کر باہر باغ میں آئے' جہاں پانچ چھ سو معززین رات کے استقبالیہ میں شامل ہونے کے لیے کافی دیر سے جمع ہو رہے تھے یہ حضرات گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ سے بھوکے پیاسے ان میزوں کے گردمنڈلا رہے تھے جو انواع و اقسام کے سامان خورد و نوش سے لدی ہوئی تھیں۔ دونوں ملکوں کے قومی ترانے بجتے ہی سارا مجمع کھانے کی میزوں پر ٹڈی دل کی طرح چھا گیا۔ ہمارے اندر والے مہمان بھی اس میں بڑے شوق سے شامل ہوئے۔ بادشاہی دعوت کا یہ طریقہ صدر اسکندر مرزا کو بڑا پسند آیا' واپس آ کر بہت عرصہ تک اس کی یاد ان کے دل میں چٹکیاں لیتی رہی۔

بغداد پکیٹ کی کانفرنسوں کے سلسلے میں صدر مرزا نے ایران' عراق اور ترکی کے بھی کئی دورے کئے۔ شاہ ایران سے ان کی خوب گاڑھی چھنتی تھی۔ ان دوروں میں بیگم ناہید مرزا ملکہ ثریا کے ساتھ بزعم خود اپنی خوش لباسی اور حسن و جمال کا مقابلہ کرتی رہتی تھیں۔ وہ ہر روز طرح طرح کے رنگوں کی نہایت بھڑکیلی اور مرصع ساڑھیاں زیب تن کرتی تھیں اور ہر تصویر میں بڑے اہتمام سے مسکراتی ہوئی نظر آنے کی کوشش میں لگی رہتی تھیں۔ ایک روز انہوں نے شکایتاً کہا۔ "ملکہ ثریا کسی تقریب اور تصویر میں مسکراتی نظر نہیں آتی۔ میرا معاملہ اس کے برعکس ہے۔ لیکن یہ اخبار والے سب

For more books visit www.4Urdu.com

اندھے ہیں۔ ہمارے درمیان اس فرق پر کوئی کچھ نہیں لکھتا۔"

شاہ ایران کی ہر تقریب میں دو تین شوخ وشنگ لڑکیاں ہمہ وقت ان کے گرد منڈلایا کرتی تھیں۔ بسا اوقات یوں محسوس ہوتا تھا کہ وہ جان بوجھ کر ملکہ ثریا کو برسر عام نظر انداز کر کے شاہ کی توجہ کا مرکز بننے کی کوشش کر رہی ہیں۔ رضا شاہ پہلوی کے اس وقت تک کوئی اولاد نہ تھی' اور نجی محفلوں میں بعض اوقات وہ شاہی وقار کا رنگ و روغن اتار کر بڑی بے حجابی سے ایک گھٹیا سے "پلے بوائے" کا اوباشانہ روپ اختیار کر لیتے تھے۔ وہ "بلیو" فلموں کے دلدادہ تھے اور یورپ اور امریکہ کے قحبہ خانوں' بیسواؤں اور فحش نگاروں کے متعلق انہیں بڑی وسیع معلومات حاصل تھیں۔ ایک روز شام کی چائے پر انہوں نے صدر اسکندر مرزا کو ڈیڑھ گھنٹہ تک جنسی علوم و فنون کے مختلف گوشوں سے آگاہ کیا اور آخر میں یہ فتویٰ صادر کیا۔ "معاشرے کی توانائی اور ترقی ناپنے کا صحیح پیمانہ یہ ہے کہ اس میں جنسی آزادی کو کتنا فروغ حاصل ہے۔"

ایک بار شاہ ایران صدر مرزا اور بیگم ناہید مرزا کو ہمراہ لے کر اصفہان' شیراز اور شہد کی سیاحت پر گئے۔ طویل فاصلے تو ہوائی جہاز سے طے کئے گئے' لیکن مقامی سیر و سیاحت کے لیے شاہ کے جلو میں موٹروں کا بڑا شاندار قافلہ چلتا تھا۔ موٹروں کا یہ شاہی جلوس جب کسی گاؤں یا قصبے سے گزرتا تھا' تو کئی جگہ سڑک پر دور دور تک قالین ہی قالین بچھے ہوئے نظر آتے تھے۔ بعد میں یہ راز کھلا کہ قالین میں اگر بہت زیادہ گرد جم کر بیٹھ جائے تو اسے صاف کرنے کا آسان طریقہ یہ ہے کہ اسے چلتی ہوئی موٹر کار کے پہیوں کے نیچے روندا جائے۔ اس طرح گرد کی جمی ہوئی تہیں ٹوٹ جاتی ہیں اور تھوڑا سا جھاڑنے سے بھی قالین صاف ہو جاتا ہے۔ اس ترکیب سے شاہ کی گزر گاہ میں اپنا قالین بچھا کر اس کی وفادار رعایا ایک ہاتھ سے پہلوی خاندان کی ہردلعزیزی پر اپنی مہر تصدیق ثبت کر دیتی تھی اور دوسرے ہاتھ سے اپنے پرانے قالینوں کی گرد جھاڑ لیتی تھی۔

For more books visit www.4Urdu.com

شیراز میں ہم ایک رات ٹھہرے۔ وہاں پر جو کار مجھے ملی' اسے ایک نوجوان چلا رہا تھا جو یونیورسٹی کا طالب علم تھا۔ یہ کار بھی اس کی اپنی تھی۔ اس نے مجھے بتایا کہ جب کبھی شاہ کے مہمان یہاں نازل ہوتے ہیں' ان کے استعمال کے لیے کاریں اہالیان شہر سے جبراً ضبط کر لی جاتی ہیں۔ ڈرائیور بھی کار کے مالک ہی فراہم کرتے ہیں۔ اگر کسی کے پاس ڈرائیور نہ ہو تو کار کے مال کو بیگار کے طور پر خود ہی یہ فرض انجام دینا پڑتا ہے۔ یہ نوجوان بڑے امیر اور معزز خاندان سے تعلق رکھتا تھا۔ لیکن اس وقت اسے سرکاری ڈرائیور کی وردی پہنا کر ہماری خدمت کے لیے مفت کی بیگار میں پکڑا ہوا تھا۔ وہ صبح سات بجے ڈیوٹی پر حاضر ہوتا تھا اور رات کے گیارہ بجے اپنی کار کو سرکاری مہمان خانے میں چھوڑ کر گھر واپس لوٹتا تھا۔ اس نے مجھے بتایا کہ شیراز میں تقریباً سارا سال رات کو کرفیو نافذ رہتا ہے اور رات کو دس بجے کے بعد لوگ اپنے گھروں سے باہر نہیں نکل سکتے۔ ہر شہر اور علاقے پر مقامی فوجی گریژن کا تسلط ہے اور خود گیریژن پر سیکرٹ سروس والوں کا کنٹرول ہوتا ہے۔ سیکرٹ سروس کے شعبے میں براہ راست شاہ کی ماتحتی میں کام کرتے ہیں۔ یہ نوجوان بڑی شدت سے شاہ ایران کا مخالف تھا اور شاہ پر نظر پڑتے ہی اس کی آنکھوں میں خون اتر آتا تھا۔

شاہ ایران کی سرکاری دعوتیں بڑی شاندار ہوتی تھیں۔ ڈنر کے دوران نصف درجن اعلیٰ فوجی افسر تمغوں سے جگمگاتی ہوئی وردیاں پہنے شاہ کی کرسی کے پیچھے بستہ اٹنشن کھڑے رہتے تھے۔ ایک ڈنر کے بعد بیگم ناہید مرزا نے مجھے کہا۔ "شاہ کی نشست کے پیچھے جو افسر کھڑے تھے' ان میں سے دو کا رینک جرنیل کے برابر تھا اور ادھر کراچی میں کپتان اور میجر کے رینک کے اے۔ ڈی۔ سی ہمارے ساتھ میز پر بیٹھ کر کھانا کھاتے ہیں۔ اس کے متعلق تم لوگوں کو کچھ سوچنا چاہیے۔"

ایک بار صدر اسکندر مرزا ایران' عراق اور سعودی عرب کے دورے پر ایسے وقت نکلے جبکہ نہر سویز کے قضیہ پر مصر پر برطانیہ اور فرانس کا حملہ ہو چکا تھا۔ وزیراعظم سہروردی

For more books visit www.4Urdu.com

اور کمانڈر انچیف جنرل ایوب خان بھی ان کے ساتھ تھے۔ جمال عبدالناصر کی غیر معتدل پالیسیوں کی وجہ سے مشرق وسطیٰ کی بادشاہتیں ان سے بہت خوفزدہ اور ناراض تھیں اور اب سامرانی طاقتوں کے حملے سے ناصر کی شکست اور تباہی کی امید باندھ کر بہت سے شاہان ذی شان خوشی سے بغلیں بجا رہے تھے۔ خصوصاً بغداد کا سماں بڑا عبرتناک تھا۔ گلیوں اور سڑکوں پر جو عوام تھے' ان کا دل مصر کے ساتھ تھا لیکن سرکاری سطح پر خوشی کے شادیانے بج رہے تھے۔ عراق کے وزیراعظم نوری السعید پاشا ہمارے گیسٹ ہاؤس میں آئے اور صدر اسکندر مرزا اور مسٹر سہروردی کے پاس بیٹھ کر انہوں نے صدر ناصر کے خلاف دیر تک زہر اگلا۔ ناصر کا ہوا ان کی رگ و پے میں اس قدر شدت سے چھایا ہوا تھا کہ' یا تو وہ اسے برملا گالی دے کر یاد کرتے تھے یا طنزیہ طور پر "جمال عبدالناصر علیہ السلام" کے نام سے پکارتے تھے۔ اسی نشست میں انہوں نے بڑے وثوق سے پیشگوئی کی کہ نہر سویز میں جمال عبدالناصر کی قبر مقدر ہو چکی ہے اور بہت جلد فرعون کی طرح اس کی لاش بھی پانی سے نکال کر عجائب گھر میں رکھ دی جائے گی۔

نہر سویز کے سلسلے میں ہمارے عوام کا رد عمل بھی دوسرے مسلمانوں کی طرح مصر کے حق میں تھا لیکن حکومت کا رویہ تذبذب' تامل' شش و پنج' پس و پیش اور حیص بیص کے تانے بانے میں الجھا ہوا تھا۔ صدر اسکندر مرزا اور وزیراعظم سہروردی اپنے عوام کے خوف سے برطانیہ اور فرانس کے حملے کی تائید تو نہ کر سکتے تھے لیکن وہ کھلے دل سے مصر کے حق میں کوئی قدم اٹھانے سے بھی قاصر تھے۔ جب ہم بغداد میں تھے تو وزیراعظم سہروردی نے اچانک مصر کا دورہ کرنے کا پروگرام بنایا۔ مصر کی حکومت فرانس اور برطانیہ کے حملے کی تباہ کاریوں کے مسائل میں الجھی ہوئی تھی۔ یوں بھی اس خاص موقع پر سہروردی صاحب کے مصر جانے کا کوئی جواز نہ تھا۔ اس لیے قدرتی طور پر مصر کی حکومت نے مسٹر سہروردی کے پروگرام کے متعلق سرد مہری سے کام لیا اور ان کے دورہ مصر کی حوصلہ افزائی نہ کی۔ تاہم ہمارے وزیراعظم چند افسروں کو ساتھ لے کر بیروت تک

For more books visit www.4Urdu.com

ضرور گئے اور وہاں کچھ سیر و تفریح اور شاپنگ کر کے واپس آ گئے۔ شاپنگ کا جنون ہم لوگوں کی گھٹی میں پڑا ہوا ہے۔

URDU4U.COM

لبنان کے ہمسائے میں مصری قوم تباہی کے دہانے پر کھڑی تھی۔ ہمارا سرکاری وفد ان کی ہمت بڑھانے قاہرہ تو نہ پہنچ سکا' لیکن بیروت کے بارونق بازاروں میں بڑے انہماک سے خرید و فروخت کے مشغلے میں مصروف ہو گیا۔ اگلے روز جب ہم بغداد سے پاکستان روانہ ہوئے تو کچھ حضرات اپنی بھاری بھر کم شاپنگ سینے سے لگائے جہاز کے اندر ہی لے آئے۔ ہوائی جہاز کے کپتان نے احتجاج کیا کہ اتنا زیادہ سامان کیبن میں رکھنا حفاظتی اصولوں کے خلاف ہے اور جب تک فالتو سامان کو ہولڈ میں منتقل نہیں کیا جاتا' وہ ہوائی جہاز اڑانے کا خطرہ مول لینے کے لیے تیار نہیں ہے۔ باہر عراق کے شاہ فیصل' پرنس عبدل الہ' وزیراعظم نوری السعید اور دیگر اکابرین ہماری روانگی کے منتظر کھڑے تھے۔ اندر سامان پر جھگڑا سر اٹھائے کھڑا تھا۔ صدر اسکندر مرزا اس قسم کے تنازعوں میں دخل دینے سے کوسوں دور بھاگتے تھے۔ وہ تو ایک اخبار اٹھا کر اسے پڑھنے میں مصروف ہو گئے اور وزیراعظم سہروردی نے بیچ بچاؤ کر کے کسی طرح یہ معاملہ سلجھایا۔ خدا خدا کر کے ہمارا جہاز کافی تاخیر کے بعد بغداد ائیرپورٹ سے روانہ ہوا اور باہر کھڑی ہوئی الوداعی پارٹی کی بھی گلو خلاصی ہوئی' جسے غالبًا یہ گمان تھا کہ شاید جہاز میں کوئی فنی خرابی واقع ہو گئی ہے۔

ایران' عراق اور سعودی عرب کے اس دورے میں یہ دلخراش حقیقت سامنے آئی کہ جمال عبدالناصر کے خلاف نفرت کی وجہ سے مصر کے غریب عوام بھی ان تینوں ملکوں کی حکومتوں کی ہمدردیوں سے ہاتھ دھو بیٹھے ہیں۔ ایک اسلامی ملک پر مغرب کی دو بڑی طاقتیں متحد ہو کر حملہ آور ہوئی تھیں لیکن اس کی مدد کے لیے دوسری اسلامی حکومتوں کے کان پر جوں تک نہ رینگی تھی۔ عالم اسلام میں نزع و نفاق اور انتشار کی یہ کیفیت بے حد شرمناک' عبرتناک اور المناک تھی۔ اس ڈرامہ میں ہمارا کردار بھی کچھ ایسا نہ تھا'

For more books visit www.4Urdu.com

جسے یاد کر کے ہم اپنا سر فخر سے اونچا کر سکیں۔

۱۴ جولائی ۱۹۵۸ء کو ایک بار پھر اسکندر مرزا کمانڈر انچیف جنرل ایوب خاں کو ہمراہ لے کر تہران کے لیے روانہ ہوئے۔ ہمارا جہاز علی الصبح چار بجے کے قریب کراچی سے روانہ ہوا۔ پروگرام یہ تھا کہ تہران میں چند گھنٹے شاہ ایران کے ساتھ مشورہ کرنے کے بعد ہم لوگ اسی شام استنبول روانہ ہو جائیں گے' جہاں بغداد پکیٹ کے سلسلے میں پاکستان' ایران' عراق اور ترکی کے سربراہان مملکت کی کانفرنس منعقد ہو رہی تھی۔ تہران پہنچ کر شہنشاہ کے ساتھ ملاقات شروع ہوئی ہی تھی کہ اچانک خبر ملی کہ بغداد میں ایک خون آشام فوجی انقلاب نے بادشاہت کا تختہ الٹ دیا ہے۔ یہ خبر سنتے ہی شاہ ایران سناٹے میں آ گئے اور کچھ دیر تک ان پر سکتہ سا طاری رہا۔ انہوں نے فارسی اور فرانسیسی زبان میں جمال عبدالناصر کو چند گالیاں دیں اور پھر دونوں ہاتھ کمر پر رکھ کر کمرے میں ادھر سے ادھر اور ادھر سے ادھر کا چکر کاٹنے لگے۔ ان کا ذہنی اضطراب اور کرب پسینے کے قطروں کی طرح ان کے چہرے سے ٹپک رہا تھا اور وہ بار بار اپنے عملے سے پوچھتے تھے کہ ٹیلی پرنٹر پر بغداد کے متعلق تازہ ترین کیا اطلاع آ رہی ہے۔ ایک بادشاہ کا تختہ الٹنے پر دوسرے بادشاہ کا رنج و الم کسی جذبہ ہمدردی اور غمگساری کا نتیجہ نہ تھا بلکہ یہ اس کے اپنے تاج و تخت کی خود حفاظتی اور فکر مندی کا عکس تھا۔ ہمدردی اور ایثار غریبوں کے ماتھے کا جھومر ہیں۔ بادشاہوں کے خزانے میں اس جنس نایاب سے خالی ہوتے ہیں۔

اسی روز ہم استنبول کے لیے روانہ ہوئے تو راستہ میں ترکی کی حکومت کا پیغام ملا کہ کانفرنس استنبول کی بجائے انقرہ میں منعقد ہو گی۔ شہنشاہ ایران بھی شام تک انقرہ پہنچ گئے اور اس طرح بغداد پکیٹ کی وہ تاریخی کانفرنس شروع ہوئی' جس میں بغداد تو پکیٹ سے نکل گیا اور صرف پکیٹ ہی پکیٹ باقی رہ گیا' جسے بعدازاں سینٹو (Cento) کا نام دے دیا گیا۔

انقرہ پہنچ کر عراقی انقلاب کی مزید تفصیلات معلوم ہوئیں۔ شاہ فیصل' پرنس عبدالہ اور

For more books visit www.4Urdu.com

وزیراعظم نوری السعیدی بڑی بے رحمی سے قتل کر دیئے گئے تھے۔ پرنس عبدل الہ اور نوری السعیدی کی لاشوں کو عوام نے دیر تک بغداد کی سڑکوں پر بھی گھسیٹا۔ ایک خبر یہ بھی تھی کہ جب پرنس عبدل الہ کے محل پر حملہ ہوا تو اس میں سے کئی نیم برہنہ یورپین لڑکیاں بھی چیختی چلاتی ہوئی برآمد ہوئیں۔ پرنس عیاش طبع آدمی تھے اور ان کے متعلق مشہور تھا کہ ان کے پاس مشرق وسطیٰ کا بہترین سردابہ شراب تھا اور وہ وقتہ فوقتہ یورپ کے نائٹ کلبوں سے نت نئی حسیناؤں کا انتخاب کر کے اپنے محلسرا کی زینت بناتے رہے تھے۔ پرنس عبداللہ شاہ فیصل کے ماموں یا چچا تھے اور درحقیقت وہی عراق کے اصلی حکمران بھی تھے۔ جواں سال بادشاہ کو انہوں نے اپنے ہاتھ میں کٹھ پتلی بنا رکھا تھا اور فتہ رفتہ اسے بھی اپنی طرز زندگی کے سانچے میں ڈھالنے کی کوشش کر رہے تھے۔

ترکی کے متعدد دوروں میں ایک بات روز روشن کی طرح عیاں ہو گئی۔ وہ یہ کہ اگر ایک بار کسی قوم کے دل میں اسلام کی روح پوری طرح سما جائے تو پھر اسے اس راہ سے منحرف کرنا قطعی ناممکن ہے۔ پچھلے پچاس برس کے دوران ماڈرن ازم اور سیکولرازم کے نام پر ترکی میں بہت بڑے طوفان آئے لیکن ترک قوم کے سواد اعظم پر اس کا کوئی خاص اثر نہیں ہوا۔ صرف ملازمت پیشہ لوگ' شہری آبادیوں کا کچھ حصہ' ڈھل مل یقین رکھنے والے نئی روشنی کے دلدادہ' تن آسان مرد' فیشن پرست عورتیں اور بیرونی افکار پر پھلنے پھولنے والے دانشور ہی زیادہ تر اس طوفان کی زد میں آئے۔ اس کے باوجود ترکی میں مسجد میں جا کر نماز پڑھنے والے مرد اور عورتوں کی تعداد بہت سے دوسرے اسلامی مالک سے کہیں زیادہ ہے۔ کئی مسجدوں میں تو صفوں کے سامنے لکڑی کی کسی قدر اونچی تختیاں بھی بچھائی ہوتی ہیں تاکہ انگریزی طرز کی ٹوپیاں اوڑھ کر نماز پڑھنے والوں کو سجدہ کرنے میں دقت پیش نہ آئے۔ ترک عوام بڑے پکے اور سچے مسلمان ہیں اور پاکستان کے لیے ان کے دل میں خاص احترام کا جذبہ ہے۔ ترک قافلے جو حج

For more books visit www.4Urdu.com

پر جاتے ہیں' وہ بھی انتظامی بندوبست' خوش تدبیری' نظم و ضبط اور ایمان و ایقان میں اپنی مثال آپ ہوتے ہیں۔

جدید ترکی میں بہت سی اسلامی روایات اور اقدار کو ازسر نو زندہ کرنے کا سہرا جلال بیار اور وزیراعظم مینڈریس کے سر ہے۔ غالباً اسی "جرم" کی پاداش میں صدر معزول اور مقید ہوئے اور وزیراعظم تختہ دار پر لٹکائے گئے لیکن عوام کے دلوں پر ان کی حکمرانی آج بھی قائم ہے۔ لوگ مسٹر مینڈریس کو شہادت کا درجہ دیتے ہیں اور دیہات میں ان کے متعلق عجیب و غریب مافوق الفطرت کہانیاں جنم لیتی رہتی ہیں۔ ایک روایت جو طرح طرح کے رنگ لے کر متواتر گردش کرتی رہتی ہے' یہ ہے کہ کئی لوگوں نے کئی بار دیکھا ہے کہ مسٹر مینڈرس سفید گھوڑے پر سوار ترکی کے بعض علاقوں میں گھوم رہے ہیں۔

وزیراعظم مینڈریس بڑے ہنس مکھ' خوش مزاج اور خوش اخلاق انسان تھے۔ ان کی پرکشش شخصیت میں اعتدال' اعتماد و عجز کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا۔ وہ بڑے دھیمے لہجے میں بات کرتے تھے اور چھوٹے سے چھوٹے آدمی کے ساتھ گفتگو کے دوران بھی ان کی گردن میں تواضع کا ہلکا سا خم آ جاتا تھا۔ ایک بار وہ انقراہ میں مسٹر مینڈریس نے مجھ سے دریافت کیا۔ "کیا تم ترکی کی سیر سے مطمئن ہو؟"

میں نے جواب دیا کہ میں مطمئن تو بہت ہوں لیکن ایک حسرت ضرور باقی ہے۔

"وہ کیا؟" انہوں نے پوچھا

"ابھی تک مولانا روم کے مزار کی زیارت نصیب نہیں ہو سکی۔" میں نے کہا۔

"بے شک قونیہ یہاں سے کافی دور ہے لیکن اگر شوق تیز ہو تو لمبے سے لمبا فاصلہ آن کی آن میں طے ہو جاتا ہے۔" انہوں نے کسی قدر فلسفیانہ انداز سے کہا۔ اس وقت تو ان کی بات میری سمجھ میں نہ آئی' لیکن کچھ دیر بعد اطلاع ملی کہ ٹرکش ایئرفورس کا ایک جہاز ہمیں قونیہ لے جانے کے لیے تیار کھڑا ہے۔ پاکستان کی وزارت خارجہ کے سیکرٹری مسٹر اکرم اللہ اور میں چند دوسرے شائقین کے ساتھ اس جہاز میں سوار ہو

For more books visit www.4Urdu.com

کر قونیہ پہنچے۔ اکرام اللہ بڑا اعلیٰ اور لطیف ادبی ذوق رکھتے تھے۔ ہوائی جہاز کی پرواز کے دوران انہوں نے ہمیں مثنوی مولانا روم کے بہت سے اشعار سنائے اور ان کے معانی پر روشنی ڈالی۔ انہیں اردو اور فارسی اساتذہ کے سینکڑوں اشعار یاد تھے اور موقع و محل کے لحاظ سے عین برجستہ شعر پڑھنے میں انہیں بڑا کمال حاصل تھا۔

قونیہ میں ٹرکش ایئرفورس کا مقامی کمانڈر ہمیں اپنی گاڑی میں مولانا روم کے مزار پر لے گیا۔ فاتحہ پڑھنے کے بعد ہم نے کچھ دیر وہاں قرآن شریف کی تلاوت کی۔ اس دوران ہم نے دیکھا کہ وردی پوش کمانڈر بھی مزار کے پاس مودب کھڑا ہے اور آنکھیں نیچی کئے زیر لب کچھ آہستہ آہستہ پڑھ رہا ہے۔ واپسی پر اکرام اللہ' صاحب نے اس سے پوچھا کہ وہ چپکے چپکے کیا پڑھ رہا تھا۔ اس سوال پر جواں سال کمانڈر کچھ جھینپ سا گیا' جیسے اسکی کوئی چوری پکڑی گئی ہو۔ پھر کسی قدر معذرت خواہانہ انداز میں اس نے بتایا کہ وہ بھی فاتحہ ہی پڑھ رہا تھا۔ ایئرفورس کے اس افسر کی طرح ترکی میں ایک خاصا وسیع طبقہ ایسا بھی ہے جو باطن میں تو اسلامی اعمال اور اقدار پر پورا پورا یقین رکھتا ہے لیکن اسے برملا ظاہر کرنے سے یا تو ازخود ہچکچاتا ہے یا کسی دباؤ کی وجہ سے مجبور ہے۔

ایک بار صدر اسکندر مرزا ترکی کے دورے پر تھے تو عیدالاضحیٰ کا دن انقرہ میں آ گیا۔ اب ترکی حکومت کے رہنماؤں کو یہ تشویش لاحق ہو گئی کہ اگر پاکستانی وفد نے عید کی نماز پڑھنے پر اصرار کیا تو پروٹوکول کے مطابق ان کو بھی مجبوراً ان کا ساتھ دینا پڑے گا۔ اگرچہ صدر جلال بیار اور وزیراعظم عدنان مینڈریس نے ترکی میں اسلامی اقدار کی از سر نو ترویج میں کافی پیش رفت کی تھی لیکن غالباً ابھی ان میں اتنی ہمت یا حمیت پیدا نہیں ہوئی تھی کہ وہ کھلے بندوں عید کی نماز میں شامل ہوں۔ چنانچہ اس گتھی کا حل انہوں نے یہ نکالا کہ عید کے روز منہ اندھیرے ہمیں ایک سپیشل ٹرین میں سوار کر کے استنبول روانہ کر دیا۔ سارا دن ہماری ٹرین ترکی کے بے شمار شہروں' قصبوں اور دیہاتوں سے گزری' اور ہم نے ترک قوم کو بالکل اسی جوش و خروش سے عید مناتے ہوئے

For more books visit www.4Urdu.com

دیکھا جیسے کہ پاکستانی عوام مناتے ہیں۔ کوئی گاؤں ایسا نظر نہ آتا تھا جس میں بلند مینار والی کم از کم ایک مسجد موجود نہ ہو۔ نئے نئے کپڑوں میں ملبوس مرد' عورتیں اور بچے جوق در جوق عید گاہوں میں جمع ہو رہے تھے اور جگہ جگہ سجے سجائے قربانی کے جانوروں کے گرد لوگوں کے ٹھٹھ کے ٹھٹھ لگے ہوئے تھے۔ جب شام ہوئی تو کئی قصبوں اور آبادیوں میں عید کی خوشی میں چراغاں بھی نظر آیا۔ اگرچہ اس روز ہمیں خود عید کی نماز نہ مل سکی لیکن ترک قوم کو عید مناتے ہوئے دیکھ کر بڑا روح پرور نظارہ نصیب ہوا۔

استنبول میں جلیل القدر صحابی حضرت ابو ایوب انصاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے مزار پر بھی حاضری نصیب ہوئی۔ یہاں پر ہر وقت زائرین کا تانتا بندھا رہتا ہے۔ بچے مزار پر اپنی عقیدت مندی کا اظہار جس سنجیدگی' رکھ رکھاؤ اور نظم و ضبط کے ساتھ کرتے ہیں اسے دیکھ کر بڑا رشک آتا ہے۔

استنبول میں ایک صاحب مجھے محمد امام مرحوم کی قبر پر بھی لے گئے۔ مرحوم محمد امام اس وفد کے ساتھ استنبول آئے تھے جو سلطان ٹیپو نے ۱۷۸۷ء میں ترکی کے سلطان عبدالحمید خاں اول کی خدمت میں بھیجا تھا۔ اس وفد کے سربراہ سید غلام علی تھے جو سلطان ٹیپو کی جانب سے کچھ خطوط اور تحائف بھی لایا تھا۔ وفد کا مقصد سلطنت عثمانیہ کے ساتھ انگریزوں کے خلاف اتحاد کرنا تھا' جو بوجوہ پورا نہ ہو سکا۔ یہ خطوط آج تک استنبول میں صدارت عظمیٰ کی Archives میں محفوظ ہیں۔

اس وفد میں سیاسی نمائندوں کے علاوہ بہت سے سوار' سپاہی اور خدمت گار تھے جن کی تعداد ۵۰ بتائی جاتی ہے۔ سردار محمد امام کے زیر کمان ۱۰۰ پیادہ سپاہی تھے۔

استنبول میں قیام کے دوران وفد میں طاعون کی وبا پھوٹی۔ غالباً سردار محمد امام اسی مرض میں مبتلا ہو کر فوت ہوئے۔ قبر پر سر کی جانب ایک پتھر کی سل پر یہ کتبہ درج ہے:

ہوالخلاق الباقی

مرحوم و مغفور

محمد امام سردار

For more books visit www.4Urdu.com

## عسکر ایلچی ٹیپو سلطان

ہند روحنہ فاتحہ
۱۲۰۲ ہجری

صدر مرزا نے بیگم مرزا کے ساتھ سپین کا بھی طویل دورہ کیا تھا۔ سپین میں جس چیز نے ان دونوں کو سب سے زیادہ متاثر کیا تھا' وہ مسجد قرطبہ نہ تھی بلکہ جنرل فرانکو کی اپنے ملک پر آہنی گرفت تھی۔ اس دورے کے بعد بہت عرصہ تک صدر اسکندر مرزا اور ان کی بیگم سپین کے نظام حکومت کے متعلق رطب اللسان رہے۔ انہوں نے وزیراعظم کو ایک تجویز بھی ارسال کی تھی کہ سی۔ ایس۔ پی کے افسروں کو نظم و نسق کی ٹریننگ کے لیے جن ملکوں میں بھیجا جاتا ہے' ان میں سپین بھی شامل کیا جائے۔

ایک روز اچانک میرے کمرے میں آئے' اور بولے' "تم زلفی کو جانتے ہو؟" یہ نام میرے لیے قطعی اجنبی تھا۔ میں نے اپنی لاعلمی کا اظہار کیا' تو وہ بڑے حیران ہوئے اور کہنے لگے' "تعجب ہے تم زلفی کو نہیں جانتے۔ بڑا سمارٹ لڑکا ہے۔ آجکل کراچی کے نائٹ لائف اسی کی وجہ سے چمکی ہوئی ہے۔"

میں نے کراچی کی نائٹ لائف کی رونق سے بھی اپنی محرومی کا اقبال کیا' تو صدر اسکندر مرزا نے مجھے بتایا ذولفقار علی بھٹو ایک نوجوان بیرسٹر ہے۔ بڑا پڑھا لکھا' آدمی ہے۔ سندھ کے امیر کبیر گھرانے سے تعلق رکھتا ہے۔ کتابیں جمع کرنے کا شوقین ہے۔ وہ ایوان صدر کی لائبریری میں سندھ کے متعلق جو بہت سے کتابیں ہیں انہیں دیکھنا چاہتا ہے۔ صدر مرزا نے مجھے ہدایت کی کہ میں ٹیلیفون کر کے اس نوجوان کو اپنے پاس بلاؤں' اور پریذیڈنٹ ہاؤس کی لائبریری استعمال کرنے میں اس کی مدد کروں۔

میرے بلاوے پر ایک چھریرے بدن کا ایک نہایت خوش لباس' خوبصورت' تیزطرار' شوخ اور سیماب صفت نوجوان میرے کمرے میں وارد ہوا۔ مسٹر ذوالفقار علی بھٹو میں بلا کی ذہانت اور فانت تھی اور انہیں بہت سے جدید علوم اور ان کے اظہار پر حیرت انگیز عبور حاصل تھا۔ چند ہی روز میں انہوں نے پریذیڈنٹ ہاؤس کی چھوٹی سی لائبریری کو کھنگال

For more books visit www.4Urdu.com

کے رکھ دیا۔ ایک روز وہ میرے کمرے میں بیٹھے کسی کتاب سے کچھ اقتباسات ٹائپ کروا رہے تھے کہ صدر اسکندر مرزا دن کے ایک بجے میری کھڑکی کے پاس آ کر رکے۔ بھٹو صاحب کو دیکھ کر انہوں نے بلند آواز سے کہا۔ "زلفی' گڈنیوز فار یو۔ تمہارا نام یو۔ این۔ او کے ڈیلیگیشن میں شامل ہو گیا ہے۔"

یہ خبر سن کر بھٹو صاحب خوشی سے سرشار ہو گئے۔ صدر مرزا کے جانے کے بعد انہو نے انگریزی ڈانس کی طرز پر میرے کمرے کے اک دو چکر کاٹے اور پھر مجھے مخاطب کر کے اپنی مخصوص اردو میں کہا۔ "آپ صاب دیکھو گے اب میں اس راہ پر آزاد ہوں' تو فارن منسٹر کی کرسی تک دوڑ لگاؤں گا۔"

بھٹو صاحب وزیر خارجہ کی منزل سے بہت آگے تک گئے' اور انجام کار اقتدار کے میدان کو یوں چھوڑا: جو کوئے یار سے نکلے تو سوئے دار چلے۔

اپنی پہلی ملاقات ہی سے وہ مجھے "آپ صاب" کہہ کر مخاطب کیا کرتے تھے۔ وزیر' وزیراعظم اور صدر کی حیثیت سے بھی انہوں نے اس اسلوب تخاطب کو بڑی وضعداری سے نبھایا۔ ان کے عروج کے آخری دور میں بہت سے وزیروں اور اعلیٰ افسروں کو اکثر یہ شکایت رہتی تھی کہ بھٹو صاحب کابینہ اور دوسری میٹنگوں میں ان کے ساتھ بڑی سختی' بدسلوکی اور ہتک آمیز رویہ سے پیش آتے ہیں۔ لیکن ذاتی طور پر مجھے کبھی کوئی ایسا تجربہ نہیں ہوا۔ میں جیسا "آپ صاب" شروع میں تھا' ویسا ہی آخر تک رہا۔

جون ۱۹۵۸ء کا اوائل تھا۔ میں اپنے دفتر میں بیٹھا کام کر رہا تھا۔ صدر اسکندر مرزا حسب دستور پورے ایک بجے اپنے کمرے سے اٹھ کر میرے دفتر کی کھڑکی کے پاس آئے' اور پوچھا' "کوئی ضروری کام باقی تو نہیں؟" میں نے نفی میں جواب دیا تو وہ خدا حافظ کہہ کر ایوان صدارت میں اپنے رہائشی حصے کی طرف روانہ ہو گئے۔ تھوڑی دور چل کر وہ اچانک رکے' اور مڑ کر تیز تیز قدم میرے کمرے میں واپس آ گئے۔ میرے کمرے میں داخل ہوتے ہی وہ بولے' "میں ایک ضروری بات تو بھول ہی گیا۔" یہ کہہ کر انہوں نے میری میز سے پریذیڈنٹ ہاؤس کی سٹیشنری کا ایک ورق اٹھایا' اور وہیں

For more books visit www.4Urdu.com

کھڑے کھڑے وزیراعظم فیروز خاں نون کے ایک دو سطری نوٹ لکھا کہ ہماری باہمی متفقہ رائے کے مطابق بری افواج کے کمانڈر انچیف کے طور پر جنرل محمد ایوب خان کی ملازمت میں دو سال کی توسیع کے احکامات فوراً جاری کر دیئے جائیں۔ اس پر انہوں نے "Immediate Most" کا لیبل اپنے ہاتھ سے پن کیا اور مجھے حکم دیا کہ میں ابھی خود جا کر یہ نوٹ پرائم منسٹر کو دوں' ان کے عملے کے حوالے نہ کروں۔

یہ مختصر سا پروانہ بڑی عجلت اور کسی قدر لاپروائی کے عالم میں لکھا گیا تھا۔ صدر اسکندر مرزا کے ہونٹوں میں لٹکے ہوئے سگریٹ کی راکھ بھی اس پر دو بار گر چکی تھی' لیکن کاغذ کے اسے چھوٹے سے پرزے نے ہمارے ملک کی تاریخ کا رخ موڑ دیا۔ اگر جون ۱۹۵۸ء میں جنرل محمد ایوب خان کی میعاد ملازمت میں دو سال کی توسیع نہ ہوتی تو پاکستان کی تقدیر کا ستارہ جس انداز سے چمکتا' اس کا زائچہ تیار کرنے کے لیے کسی خاص علم نجوم کی ضرورت نہیں ہے!

۱۹۵۸ء کا سال چڑھتے ہی اسکندر مرزا صاحب کی کرسی صدارت پر عام انتخابات کا خوف شمشیر برہنہ کی طرح لٹک گیا۔ انتخابات نومبر ۱۹۵۷ء میں منعقد ہونے تھے۔ لیکن کسی قدر ہیرا پھیری کے بعد ۱۹۵۸ء تک ملتوی ہو گئے۔ بعدازاں مزید ہیرا پھیری کے بعد ۱۹۵۹ء تک کھسک گئے۔ نئے آئین کے تحت کوئی صدر مسلسل دو میعادوں تک اس عہدے پر فائز نہیں رہ سکتا تھا۔ اگر انتخابات ہوتے' تو میجر جنرل اسکندر مرزا کو صدارت سے دستبردار ہونا پڑتا یا اگر وہ دوبارہ صدر بننا چاہتے تو اپنے منصب سے استعفیٰ دے کر از سر نو صدارتی انتخابات لڑ سکتے تھے۔ یہ دونوں صورتیں ان کے لیے سوہان روح تھیں۔ اس لیے انہوں نے اپنی تمام صلاحیتیں بروئے کار لا کر انتخابات ہی سے پیچھا چھڑانے کی ٹھان لی۔

اس مقصد کے لیے انہوں نے کئی حربے استعمال کئے۔ اپنے دیرینہ دوست ڈاکٹر خان صاحب سے انہوں نے ایک شوشہ چھڑوایا کہ صدر مملکت کی سرکردگی میں ایک انقلابی کونسل قائم ہونی چاہیے جو مملکت کا سارا کاروبار خود چلائے۔ اس احمقانہ تجویز پر کسی نے کوئی

For more books visit www.4Urdu.com

دھیان نہ دیا اور سب نے یہی سمجھا کہ ایک پرانا کانگرسی لیڈر سٹھیا کر ایسے ہی دور از کار بڑ ہانک رہا ہے۔ ڈاکٹر خان صاحب تو لاہور میں ناگہانی طور پر قتل ہو گئے لیکن صدر اسکندر مرزا کے کچھ نادان دوست اس بے تکی اور فضول سکیم پر بدستور جمے رہے۔

URDU4U.COM

چنانچہ ملک کے کئی شہروں میں انہوں نے اس مضمون کے پوسٹر چھپوا کر دیواروں پر چسپاں بھی کئے' جس کا نتیجہ صرف یہ نکلا کہ صدر مرزا کے خلاف سیاسی حلقوں میں بدظنی اور بھی بڑھ گئی۔

قلات کے "خان اعظم" میر احمد یار خاں بلوچ نے اپنی کتاب Inside Baluchistan میں صدر اسکندر مرزا کی ایک عجیب سازباز کا حوالہ دیا ہے۔ انہوں نے لکھا ہے کہ صدر نے ان کے ساتھ وعدہ کیا تھا کہ وہ قلات کو "ون یونٹ" سے الگ کرنے میں ان کی پوری پوری مدد کریں گے۔ اس کے عوض انہوں نے اپنے صدارتی انتخاب کے لیے ان سے پچاس لاکھ روپے کی رقم طلب کی تھی اور بہاولپور سے چالیس لاکھ اور خیرپور سے دس لاکھ روپے حاصل کرنے کی خواہش کا اظہار کیا تھا۔ میر احمد یار خاں کے بیان کے مطابق صدر اسکندر مرزا نے یہ منصوبہ بنایا تھا کہ وہ پاکستان میں مارشل لاء نافذ کر کے نواب بھوپال کو وزیراعظم بنا دیں گے اور خود صدارت کی کرسی پر بیٹھ کر آمرانہ طریقے سے حکومت کریں گے۔ اس مقصد سے انہوں نے نواب بھوپال کو کراچی بلا بھی لیا تھا۔ لیکن خان آف قلات کا مشورہ سن کر نواب صاحب نے یہ پیش کش قبول نہ کی۔

ایک بار راجہ صاحب محمود آباد نے مجھے خود بتایا تھا کہ صدر اسکندر مرزا نے انہیں بھی کچھ ایسا ہی سبز باغ دکھانے کی کوشش کی تھی۔ لیکن راجہ صاحب بڑے صاحب فراست و بصیرت انسان تھے۔ اس لیے ان کے چکر میں نہ آئے۔

ادھر ایوان صدارت میں میجر جنرل اسکندر مرزا اپنی محلاتی سازشوں میں مصروف تھے' ادھر باہر ملک کے طول و عرض میں سیاسی سرگرمیاں روز بہ روز تیزی سے بڑھتی جا رہی تھیں۔ جمہوریت کا خاصہ ہے کہ جس رفتار سے انتخابات کا وقت قریب آتا ہے اسی رفتار سے

For more books visit www.4Urdu.com

سیاست کے رگ و ریشے میں خون کا دباؤ اور درجہ حرارت بڑھنے لگتا ہے۔ ہمارے وطن میں پہلے عام انتخابات آزادی کے گیارہ برس بعد ہونے والے تھے' اس لیے انتخابی بخار میں غیر معمولی جوش و خروش اور حدت و شدت بالکل قدرتی اور لازمی امر تھا۔ سیاسی جماعتیں' اپنی اپنی انتخابی مہم میں سرگرم عمل ہو گئیں۔ خاص طور پر مغربی پاکستان میں مسلم لیگ نے ایک نئے ولولے سے سر اٹھایا اور خان عبدالقیوم خان کی قیادت میں عوام الناس کے ساتھ اپنی وابستگی کے بڑے شاندار مظاہرے کئے۔ خان قیوم کی تقریروں میں صدر اسکندر مرزا کی سیاسی ریشہ دوانیو کو خاص طور پر تنقید کا نشانہ بنایا جاتا تھا۔ یہ ساری کاروائی ایک خالص سیاسی عمل تھا' جسے نوکر شاہی کی آغوش میں پلے ہوئے حکمران طبقے جمہوریت کی عینک سے دیکھنے سے قطعی طور پر قاصر تھے۔ سیاست میں اس طرح کی ارتقائی ترقی اور فروغ ان کی عقل و فہم سے سراسر بالا تھے۔ خاص طور پر صدر اسکندر مرزا کو اس میں شرپسندی اور ملک دشمنی کے علاوہ کچھ نظر نہ آتا تھا کیونکہ انتخابات کے نتیجہ میں ان کو خود اپنا سنگھاسن ڈولتا ہوا محسوس ہوتا تھا۔

مشرقی پاکستان میں بھی سیاسی سرگرمیاں اپنے عروج پر تھیں۔ وہاں پر ایک افسوسناک واقعہ یہ پیش آیا کہ صوبائی اسمبلی کے ڈپٹی سپیکر اسمبلی کے اندر ایک ہنگامے میں زخمی ہو کر وفات پا گئے۔ یہ حادثہ اپنی جگہ بڑا المناک بلکہ شرمناک تھا لیکن جمہوریت کی تاریخ میں کوئی ایسا عجوبہ روزگار بھی نہ تھا۔ بڑے بڑے شائستہ' ترقی یافتہ' نستعلیق ممالک کی پارلیمانی نظام کے ارتقا کی تاریخ اشتعال انگیزی' ہنگامہ آرائی' لپاڈگی اور تشدد کے واقعات سے پٹی پڑی ہے۔ صدر اسکندر مرزا جمہوریت سے اس وجہ سے خائف تھے کہ ان کے اپنی ذاتی مفاد پر زد پڑتی تھی' لیکن ملک کے مفاد کی آڑ لے کر ان کی حکومت نے اس ایک واقعہ پر سراسر غیر متناسب رنگ و روغن چڑھا کر اسے جمہوریت کے تابوت میں ایک موثر کیل کے طور پر گاڑنا شروع کر دیا۔

۲۲ ستمبر ۱۹۵۸ء کو دن کے ایک بجے جب صدر اسکندر مرزا اپنے دفتر سے اٹھے تو حسب

For more books visit www.4Urdu.com

معمول میرے کمرے کی کھڑکی کے پاس آ کر نہ رکے بلکہ مجھے باہر برآمدے میں اپنے پاس بلا بھیجا۔ ان کے ہاتھ میں پاکستان کے آئین کی ایک جلد تھی۔ انہوں نے اس کتاب کی طرف اشارہ کر کے مجھ سے پوچھا۔ "تم نے اس Trash کو پڑھا ہے؟"

URDU4U.COM

جس آئین کے تحت حلف اٹھا کر وہ کرسی صدارت پر براجمان تھے' اس کے متعلق ان کی زبان سے Trash کا لفظ سن کر میرا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا۔ میرے جواب کا انتظار کئے بغیر انہوں نے آئین پر تنقید و تنقیض کی بوچھاڑ شروع کر دی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے وہ کوئی پہلے سے رٹا ہوا آموختہ دہرا رہے ہوں کچھ دیر بولنے کے بعد وہ بڑی باقاعدگی سے ٹیپ کا یہ فقرہ دہراتے تھے' کہ یہ آئین بالکل ناقابل عمل ہے۔

اسی طرح تقریر کرتے کرتے وہ سیڑھیاں چڑھ کر اوپر کی منزل میں اپنے رہائشی کمروں کے نزدیک پہنچ گئے۔ وہاں پر ان کے چند ذاتی دوست لنچ کے لیے آئے ہوئے تھے۔ صدر مرزا تو اپنی تقریر ادھوری چھوڑ کر ان میں گھل مل گئے اور میں واپس لوٹ آیا۔ آئین کے متعلق ان کے بہت سے فقرے ہتھوڑی کی طرح کھٹ کھٹ میرے کانوں میں بج رہے تھے۔ واپسی پر جب میں سیڑھیاں اتر رہا تھا تو اچانک میری ٹانگیں بے جان سی ہو گئیں اور مجھے یوں محسوس ہونے لگا جیسے ایسکیلیٹر کی طرح نیچے والی سیڑھیاں بڑی تیزی سے اوپر کی طرف آ رہی ہیں۔ میں دیوار کے ساتھ ٹیک لگا کر سیڑھیوں پر ہی بیٹھ گیا۔ سیکیورٹی کا ایک آدمی بھاگتا ہوا آیا اور مجھے سہارا دے کر نیچے لایا۔ برآمدے میں صدر کے معالج کرنل سرور کھڑے تھے انہوں نے جلدی جلدی میرا معائینہ کیا اور پھر کار میں ڈال کر جناح ہسپتال کے Intensive Care Unit میں داخل کر دیا۔

دو روز کے بعد جب مجھے Intensive Care سے عام کمرے میں منتقل کیا گیا تو بیگم ناہید مرزا مجھے دیکھنے آئیں' اور بولیں "کرنل سرور نے ہمیں بتایا ہے کہ تمہارے ہارٹ کو زیادہ نقصان نہیں پہنچا۔ امید ہے تم دس بارہ روز میں ہسپتال سے فارغ ہو جاؤ گے۔ بڑا نازک وقت آنے والا ہے۔ جلدی جلدی ٹھیک ہو کر کام پر آنے کی کوشش کرو۔"

For more books visit www.4Urdu.com

ایک بار صدر سکندر مرزا بھی آئے اور اسی قسم کی گفتگو کر کے چلے گئے۔ ۷ اکتوبر کو مجھے ہسپتال سے چھٹی ملی' لیکن ڈاکٹر نے مشورہ دیا کہ فوراً دفتر جانا شروع نہ کروں بلکہ دو چار روز اور گھر پر آرام کروں۔ ۷ اکتوبر کو میں نے اپنے دفتر ٹیلیفون کر کے کام کاج کا حال دریافت کیا تو میرے عملے نے بتایا کہ کئی روز سے دفتری کاروبار بند پڑا ہے۔ صدر مرزا زیادہ وقت جنرل محمد ایوب خاں کے ساتھ ملاقاتوں میں گزارتے ہیں۔ فائلیں جوں کی توں پڑی رہتی ہیں۔ کئی روز سے کسی نے ان کو ہاتھ نہیں لگایا۔ اسی روز رات گئے ایک صاحب نے پریذیڈنٹ ہاؤس سے ٹیلیفون کر کے مجھے اطلاع دی کہ ابھی ابھی ملک بھر میں مارشل لاء نافذ ہو گیا ہے۔ آئین منسوخ کر دیا گیا ہے۔ مرکزی اور صوبائی حکومتیں اور اسمبلیاں توڑ دی گئی ہیں اور جنرل محمد ایوب خاں چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر مقرر ہو گئے ہیں۔

۸ اکتوبر کی صبح کو میں اپنے دفتر گیا تو اسکندر مرزا صاحب ایوان صدر کی فضا میں کٹی ہوئی پتنگ کی طرح ڈول رہے تھے۔ آئین کو منسوخ کر کے انہوں نے اپنے ہاتھوں وہ درخت ہی کاٹ کر پھینک دیا تھا جس کے سائے میں بیٹھ کر انہیں صدارت کی کرسی نصیب ہوئی تھی۔ فوج کے شعبہ قانون کے ماہرین نے صاف طور پر یہ فیصلہ دے دیا تھا کہ آئین کی منسوخی کے ساتھ ہی صدر کا عہدہ بھی ختم ہو گیا ہے اور اب حکومت کا واحد سربراہ چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر ہے۔ میجر جنرل اسکندر مرزا نے اپنی پوزیشن مستحکم کرنے کے لیے بڑے ہاتھ پاؤں مارے۔ کچھ سول افسروں کو ساتھ ملا کر انہوں نے کراچی کے مزدوروں سے اپنے حق میں ایک پھسپھسا سا مظاہرہ بھی کروایا تا کہ جنرل ایواب خان پر عوام میں اپنی ہردلعزیزی کا رعب گانٹھ سکیں۔ مسلح افواج میں پھوٹ ڈالنے کے لیے انہوں نے پاک فضائیہ کے ایئرکموڈور مقبول رب کے ذریعہ چند فوجی جرنیلوں کو گرفتار کرنے کی بھونڈی سی ناکام کوشش بھی کی۔ اس کے علاوہ انہوں نے جنرل ایوب خاں کو اپنی راہ سے ہٹانے کے لیے اپنی روایتی محلاتی سازشوں کے تانے بانے بھی بڑی چالاکی سے بننا شروع کر دیئے لیکن جس محلسرا پر آئین کا سایہ قائم نہ رہے' اس

For more books visit www.4Urdu.com

کی بنیادیں کھوکھلی ہو جاتی ہیں۔ مارشل لاء میں حکومت اس کی ہوتی ہے جس کے ہاتھ میں طاقت ہو۔ یہ فوقیت ایوب خاں کو حاصل تھی۔ چنانچہ عین بیس روز بعد رات کے وقت فوج کے ایک دستے نے ایوان صدر کو گھیرے میں لے لیا۔ تین جرنیل اور ایک مسلح بریگیڈیئر اسکندر مرزا کے پاس گئے اور انہیں کرسی صدارت سے اتار کر پہلے کوئٹہ اور پھر لندن روانہ کر دیا۔

۲۶ اکتوبر ۱۹۵۸ء کی رات کو جب میجر جنرل اسکندر مرزا اپنی بیگم کے ساتھ پریذیڈنٹ ہاؤس سے آخری بار رخصت ہو رہے تھے تو انہوں نے ایک جرنیل کو ایک نیا فاؤنٹن پین دے کر کہا کہ وہ یہ الوداعی تحفہ ان کی طرف سے مجھے پہنچا دیں۔ اگلی صبح جب یہ تحفہ مجھے ملا تو مجھے ان کے اعصابی کس بل پر بڑا تعجب ہوا۔ جس وقت میجر جنرل اسکندر مرزا اور بیگم ناہید مرزا پریذیڈنٹ ہاؤس سے نکل رہے تھے تو انہیں وثوق سے یہ علم نہ تھا کہ یہاں سے انہیں جیل میں پہنچایا جائے گا یا کسی فوجی بارک میں نظر بند کیا جائے گا یا کہیں لے جا کر گولی سے اڑا دیا جائے گا' یا واقعی کوئٹہ اور لندن بھیجا جائے گا۔ اس بے چینی اور رواروی کے عالم میں اپنے سیکرٹری کو یاد رکھنا اور اس کے الوداعی تحفہ چھوڑنا بڑے دل گردے کا کام تھا۔

جمہوریت کو پامال کرنے کا جو عمل مسٹر غلام محمد نے شروع کیا تھا' میجر جنرل اسکندر مرزا نے اسے پایہ تکمیل تک پہنچا دیا۔ اکتوبر ۱۹۵۸ء میں آئین منسوخ کرنے کا بالکل کوئی جواز نہ تھا۔ اس وقت پاکستان کسی غیر معمولی بیرونی خطرے سے دو چار نہ تھا۔ اندرونی "خطرہ" صرف یہ تھا کہ اگر انتخابات منعقد ہو جاتے' تو غالباً اسکندر مرزا صاحب کو کرسی صدارت سے ہاتھ دھونا پڑتا اپنی صدارت کو اس افتاد سے بچانے کے لیے انہوں نے یہ رٹ لگائی کہ ۱۹۵۶ء کا آئین ناقابل عمل ہے۔ یہ بڑا بھونڈا عذر لنگ تھا۔ آئین کو پرکھنے کی کسوٹی انتخابات اور منتخب اداروں کا کردار ہوتا ہے۔ اس آئین کے تحت ایک بھی الیکشن نہ ہوئی تھی۔ اس لیے اس پر ناقابل عمل ہونے کا الزام لگانا سراسر بے

For more books visit www.4Urdu.com

معنی اور بے بنیاد تھا۔ اپنے ذاتی اقتدار کی حفاظت کے لیے صدر اسکندر مرزا نے مارشل لاء کی راہ ہموار کی۔ جنرل ایوب خاں پچھلے چار برس سے اسی نفسیاتی لمحے کا انتظار کر رہے تھے۔ مارشل لاء نافذ کر کے انہوں نے سب سے پہلے صدر مرزا کو بیک بنی و دوگوش نکال باہر کیا۔ پھر اپنے بنے بنائے پلان کے مطابق حکمرانی شروع کر دی۔ یہ پلان انہوں نے ۴ اکتوبر ۱۹۵۴ء کی رات کو لندن کے ڈارچسٹر ہوٹل میں بیٹھ کر بنایا تھا اور اقتدار کے اگلے دس برس انہوں نے قریباً قریباً انہی خطوط پر اپنی صدارت کو استوار کیا۔

پاکستان میں جمہوریت پہلے ہی سسک سسک کر جی رہی تھی۔ آئین کی منسوخی نے اس کا گلا اور بھی گھونٹ دیا۔ زندگی اور جمہوریت میں ایک قدر مشترک یہ ہے کہ پے در پے ناکامیوں کی وجہ سے دونوں منقطع نہیں ہوتیں بلکہ جوں توں چلتی رہتی ہیں۔ اگر جمہوریت ناکام ہونے لگے' تو نقل خون (Blood Transfusion) کی طرح اس کا واحد علاج مزید جمہوریت ہے۔ دوبارہ ناکام ہونے لگے تو اور بھی مزید جمہوریت۔ باقی سب طریقے عطائیوں' اناڑی ریفارمروں اور نیم حکیموں کے نسخے ہوتے ہیں جو ملک اور قوم کے لیے خطرہ جان ثابت ہو سکتے ہیں۔ بدقسمتی سے جنرل ایوب خاں نے دوسرا طریقہ اختیار کیا اور جمہوریت کے نام پر انہوں نے جس نظام کی داغ بیل ڈالی' اس نے ان کے دور صدارت کے ساتھ ہی دم توڑ دیا۔

جمہوریت کا سکہ اسی وقت تک چلتا ہے جب تک کہ وہ خالص ہو۔ جوں ہی اس میں کھوٹ مل جائے' اس کی کوئی قدر و قیمت باقی نہیں رہتی۔

○○○

For more books visit www.4Urdu.com

## • جنرل ایوب خان کی اٹھان

میجر جنرل اسکندر مرزا کی برطرفی کے بعد اگلی صبح میں اپنے دفتر گیا' تو ایوان صدارت میں الو بول رہا تھا۔ چاروں طرف سناٹا چھایا ہوا تھا اور اکا دکا نوکر چاکر اور گارڈ کے سپاہی سرگوشیوں میں رات کے واقعات پر تبصرہ کر رہے تھے۔ جنرل ایوب خان نے صدارت کا عہدہ سنبھال لیا تھا' لیکن وہ ابھی ایوان صدر میں منتقل نہیں ہوئے تھے۔

مجھے یقین تھا کہ اب مجھے اس بیت الجن سے چھٹکارا نصیب ہو جائے گا کیونکہ نئے صدر کے لیے فوجی لوگ ضرور اپنی پسند کا سیکرٹری رکھنا چاہیں گے۔ میں نے اپنے کاغذات درست کئے اور دستور کے مطابق اپنی چارج رپورٹ تیار کر ہی رہا تھا کہ یکایک یونیفارم میں ملبوس جنرل ایوب خاں میرے کمرے کی کھڑکی میں نمودار ہوئے۔ وہ اتنے طویل القامت تھے کہ اگر کھڑکی کے پاس سیدھے کھڑے ہو کر بولتے تو چھت کے ساتھ باتیں کرتے نظر آتے۔ انہوں نے جھک کر کھڑکی کی چوکھٹ سے آگے والی دہلیز پر اپنے دونوں ہاتھ رکھے اور مجھے باہر آنے کو کہا۔

مجھے ساتھ لے کر وہ کافی دیر تک باہر چبوترے پر ٹہلتے رہے۔ پہلے انہوں نے اسکندر مرزا کے ساتھ اپنی دیرینہ دوستی کا ذکر کیا۔ پھر پچھلے دو تین ہفتوں کے دوران ان کی سازشوں اور بیوفائیوں پر طویل روشنی ڈالی۔ مجھے ان کی اس گفتگو پر بڑی حیرت ہوئی۔ جنرل ایوب خاں سے میرے کوئی قریبی مراسم نہ تھے۔ یونہی دور ہی دور سے رسمی سی ملاقات تھی۔ میرا خیال ہے اسکندر مرزا کو برطرف کرنے کا ان کے ذہن پر کسی قدر بوجھ تھا۔ وہ اس قسم کی گفتگو کر کے اپنا بوجھ ہلکا کرنا چاہتے تھے۔ صبح سویرے میں پہلا سویلین تھا' جو ان کے ہاتھ آ گیا۔ چنانچہ انہوں نے مجھے اپنی ذہنی چاند ماری کا تختہ مشق بنا کے اسکندر مرزا کے ساتھ اپنی وفاداری کا حق ادا کر دیا۔ انسان کے دماغ میں ایسی خود کار مشین نصب ہوتی ہے' جو اندرونی اضطراب کے وقت اسے اپنی مرضی کی سکون آور

For more books visit www.4Urdu.com

گولیاں بنا بنا کر کھلاتی رہتی ہے۔

اس روز صدر ایوب خاں کی پہلی کیبنٹ میٹنگ ہونے والی تھی۔ کچھ وزیر برآمدے میں آ کر جمع ہو گئے تھے۔ انہیں دیکھ کر صدر نے کہا' "میں چاہتا ہوں کہ کابینہ کی پہلی چند میٹنگوں میں تم بھی بیٹھو تاکہ تم میرے خیالات سے واقف ہو جاؤ۔"

یہ موقع ہاتھ آتے ہی میں نے گذارش کی' "جناب' دراصل میں اپنی چارج رپورٹ مکمل کر رہا تھا تاکہ آپ اپنی پسند کا نیا سیکرٹری متعین کر لیں۔"

یہ سن کر صدر ایوب چلتے چلتے رک گئے اور بولے۔ "ہم فوجی لوگ ہر بات کی تحقیق کرنے کے عادی ہیں۔ ہم نے انکوائری کر لی ہے۔ تم کسی چیز میں ملوث نہیں ہو۔ اس لیے میں نے تم کو اپنا سیکرٹری مقرر کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔"

یہ سن کر میرا نفس کچھ پھول سا گیا۔ نفس جتنا فربہ ہو' عقل اتنی ہی کمزور پڑ جاتی ہے اور قوت فیصلہ پر خود فریبی کا غبار چھا جاتا ہے۔ میرا بھی حشر ایسا ہی ہوا۔ دوسرے بہت سے لوگوں کی طرح میں بھی اس غلط مہمی میں مبتلا ہو گیا کہ نیا صدر جو نیا نظام لانا چاہتا ہے' شاید وہی ملک کے لیے سود مند ثابت ہو۔ اس وقت یہ بات میرے وہم و گمان میں بھی نہ آئی کہ یہ نظام ریت کا گھروندا ہے' جو ایوب خاں کی صدارت ختم ہوتے ہی دھڑام سے گر جائے گا۔ جمہوریت بڑی غیرت مند اور حاسد دلہن ہے۔ اس کے اوپر سوکن کا سایہ بھی پڑ جائے تو یہ گھر بار جلا کر خاکستر کر دیتی ہے۔

اس نئے دور میں کام شروع کرتے ہی میرے دل میں یہ بات کھٹکی کہ مارشل لاء نافذ ہونے کے بعد اب تک جتنے سرکاری اعلانات' قوانین اور ریگولیشن جاری ہوئے ہیں۔ ان میں صرف حکومت پاکستان کا حوالہ دیا ہے' حکومت اسلامی جمہوریہ پاکستان کا کہیں ذکر نہیں آیا۔ پہلے تو میں نے سوچا کہ شاید ڈرافٹنگ میں غلطی سے ایک آدھ بار یہ فروگذاشت ہو گئی ہو گی۔ لیکن جب ذرا تفصیل سے جائزہ لیا تو معلوم ہوا کہ جس تواتر سے یہ فروگزاشت دہرائی جا رہی ہے۔ وہ سہواً کم اور التزاماً زیادہ محسوس ہوتی ہے۔

For more books visit www.4Urdu.com

اس پر میں نے ایک مختصر سے نوٹ میں صدر ایوب کی خدمت میں تجویز پیش کی کہ اگر وہ اجازت دیں تو وزارت قانون اور مارشل لاء ہیڈ کوارٹر کی توجہ اس صورت حال کی طرف دلائی جائے اور ان کو ہدایت دی جائے کہ جاری شدہ تمام اعلانات اور قوانین کی صحیح کی جائے اور آئندہ کے لیے اس غلطی کو نہ دہرایا جائے۔

صدر ایوب کا قاعدہ تھا کہ وہ فائلیں اور دوسرے کاغذات روز کے روز نپٹا کر میرے پاس واپس بھیج دیا کرتے تھے۔ لیکن معمول کے برعکس یہ نوٹ کئی روز تک میرے پاس واپس نہ آیا۔ ۵ نومبر کی شام کو میں اپنے دفتر میں بیٹھا دیر تک کام کر رہا تھا۔ باہر ٹیرس پر صدر ایوب اپنے چند رفیقوں کے ساتھ کسی معاملے پر گرما گرم بحث کر رہے تھے۔ گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ کے بعد جب سب لوگ چلے گئے تو صدر میرے نوٹ کا پرچہ ہاتھ میں لیے میرے کمرے میں آئے۔ وہ غیر معمولی طور پر سنجیدہ تھے آتے ہی انہوں نے میرا نوٹ میرے حوالے کیا اور کہا۔ "تمہیں غلط فہمی ہوئی ہے۔ ڈرافٹنگ میں کسی نے کوئی غلطی نہیں کی۔ بلکہ ہم نے سوچ سمجھ کر یہی طے کیا ہے کہ اسلامک ری پبلک آف پاکستان سے اسلامک کا لفظ نکال دیا جائے۔

"یہ فیصلہ ہو چکا ہے یا ابھی کرنا ہے" میں نے پوچھا۔

President,s Order (Post proclamation) No. 1 of 1958.
Laws (Continuance in Force), Order, 1958,
10th October, 1958

صدر ایوب نے کسی قدر غصے سے مجھے گھورا اور سخت لہجے میں کہا۔ "ہاں' ہاں فیصلہ ہو گیا ہے۔ کل صبح پہلی چیز مجھے ڈرافٹ ملنا چاہیے۔ اس میں دیر نہ ہو۔"

اتنا کہہ کر وہ خدا حافظ کہے بغیر تیز تیز قدم کمرے سے نکل گئے۔ اگر مجھ میں ہمت ہوتی تو میں بھی ان کے پیچھے پیچھے بھاگتا اور انہیں روک کر پوچھتا کہ اسلامی جمہوریہ پاکستان سے اسلامی کا لفظ حذف کرنے والے آپ کون ہوتے ہیں؟ لیکن اتنی ہمت مجھ میں نہ تھی اس لیے میں بھی دم دبائے چپ چاپ گھر واپس آ گیا۔ بڑے سوچ بچار کے بعد صبح کے قریب میں نے پریس ریلیز تو تیار نہ کیا بلکہ اس کی جگہ دو ڈھائی

For more books visit www.4Urdu.com

صفحوں کا ایک نوٹ لکھا' جس کا لب لباب یہ تھا کہ پاکستان کو اسلام سے فرار ممکن نہیں۔ اس ملک کی تاریخ پرانی لیکن جغرافیہ نیا ہے۔ ہندوستان اور پاکستان کے درمیان ریڈ کلف لائن صرف اس وجہ سے کھینچی گئی تھی کہ ہم نے یہ خطہ ارض اسلام کے نام پر حاصل کیا تھا۔ اب اگر پاکستان سے اسلام کا نام الگ کر دیا گیا تو حد بندی کی یہ لائن معدوم ہو جائے گی۔ ہم پاکستانی صرف اس وجہ سے بنے کہ ہم مسلمان تھے۔ اگر افغانستان' ایران' مصر' عراق اور ترکی اسلام کو خیر باد کہہ دیں تو پھر بھی وہ افغانی' ایرانی' مصری' عراقی اور ترک ہی رہتے ہیں۔ لیکن ہم اسلام کے نام سے راہ فرار اختیار کریں تو پاکستان کا اپنا الگ کوئی وجود قائم نہیں رہتا۔ اس لیے اسلام ہماری طبع نازک کو پسند خاطر ہو نہ ہو' اسلام ہماری طرز زندگی کو راس آئے یا نہ آئے' ذاتی طور پر ہم اسلام کی پابندی کرتے ہوں یا نہ کرتے ہوں' حقیقت بہرحال یہی ہے کہ اگر آخرت کے لیے نہیں تو اسی چند روزہ زندگی میں خود غرضی کے طور پر اپنے وطن کی سلامتی کے لیے ہمیں اسلام کا ڈھول اپنے گلے میں ڈال کر برسر عام ڈنکے کی چوٹ بجانا ہی پڑے گا' خواہ اس کی دھمک ہمارے حسن سماعت پر کتنی ہی گراں کیوں نہ گزرے۔

جمہوریہ پاکستان کے ساتھ اسلامک کا لفظ لگانے سے اگر کسی کا ذہن قرون وسطیٰ کی طرف جاتا ہے تو جانے دیں۔ دوسروں کی جہالت کی وجہ سے اپنے آپ کو احساس کمتری میں مبتلا کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔

ساتھ ہی میں نے ایک الگ کاغذ پر اپنا استعفیٰ بھی لکھ لیا کہ خرابی صحت کی بنا پر میں کام کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتا' اس لیے میرا ستعفیٰ منظور کر کے مجھے ریٹائر ہونے کی اجازت دی جائے۔

یہ دونوں چیزیں میں نے اپنی بیوی کو دکھائیں تو اس نے مجھے خوب شاباش دی اور غالباً میرا دل بڑھانے کو کہا۔ "مجھے کیا معلوم تھا کہ آپ انگریزی بھی اتنی اچھی لکھ لیتے ہیں!"

یہ بات سن کر میں جل گیا۔ "محترمہ' تم انگریزی زبان کے چسکے میں پڑ گئی ہو۔ یہ

For more books visit www.4Urdu.com

نہیں دیکھا کہ میں نے استعفیٰ بھی لکھ رکھا ہے۔ شاید سچ مچ اس کی نوبت بھی آ جائے۔ اس کے متعلق کیا خیال ہے؟"

URDU4U.COM

اس نے کہا۔ "ظاہر ہے کہ اس معاملے میں اگر آپ کی بات رد ہو گئی تو استعفیٰ دے دینا چاہیے۔ یہ نوکری چلی گئی تو کچھ اور کام کر لینا۔ کسی کام کو جی نہ چاہے' تو آرام سے گھر بیٹھ کر لکھنا پڑھنا۔ آخر میں نے ڈاکٹری کی ڈگری کس روز کے لیے لی ہے۔"

ہماری شادی کو ابھی صرف ڈیڑھ برس ہوا تھا۔ میں دفتر جانے لگا تو عفت غالباً شرارت سے بولی۔ "آپ صورت حال سے نپٹ لیں گے یا میں بھی ساتھ چلوں؟"

میں اپنے آفس وقت سے پہلے پہنچ گیا۔ خیال تھا کہ صدر ایوب کے آنے سے پہلے اپنا نوٹ ٹائپ کروا رکھوں گا۔ لیکن وہاں دیکھا تو صدر صاحب پہلے ہی برآمدے میں ٹہل رہے تھے۔ مجھے دیکھتے ہی کمرے میں آ گئے اور پوچھا۔ "ڈرافٹ تیار ہے؟"

میں نے جواب دیا کہ تیار تو ہے لیکن ابھی ٹائپ نہیں ہوا۔

"کوئی بات نہیں۔" انہوں نے کہا۔ "ایسے ہی دکھاؤ۔"

وہ میرے سامنے والی کرسی پر بیٹھ گئے اور میرے ہاتھ کا لکھا ہوا نوٹ پڑھنے لگے۔ چند سطریں پڑھ کر کچھ چونکے اور پھر از سر نو شروع سے پڑھنے لگے۔ جب ختم کر چکے تو کچھ دیر خاموش بیٹھے رہے۔ پھر آہستہ سے بولے "Yes, Right You Are" یہ فقرہ انہوں نے دوبار دہرایا اور پھر نوٹ ہاتھ میں لیے کمرے سے چلے گئے۔ اس کے بعد اس موضوع پر پھر کسی نے کبھی کوئی بات نہیں کی۔

چند روز بعد میں کچھ فائلیں لے کر صدر ایوب کے پاس بیٹھا ہوا تھا۔ وہ اپنی ڈاک دیکھ رہے تھے۔ ایک خط پڑھ کر بولے۔ کچھ لوگ مجھے خط لکھتے ہیں' کچھ لوگ ملنے بھی آتے ہیں اور کہتے ہیں کہ دنیا بدل گئی ہے۔ اب ماڈرن ازم اور اسلام اکٹھے نہیں چل سکتے۔ میں ان سے کہتا ہوں۔

"Pakistan has no Escape from Islam....." اس کے بعد انہوں نے پے در پے

For more books visit www.4Urdu.com

میرے نوٹ کے کئی اور فقرے بھی دہرائے------ ان میں یہ عجیب صلاحیت تھی کہ اگر کوئی بات واقعی ان کے دل میں گھر کر جاتی تھی تو وہ بڑی معصومیت سے اسے اپنا لیتے تھے۔

URDU4U.COM

ایک روز وہ کہنے لگے کہ انہوں نے بچپن میں قرآن شریف ختم تو کیا ہے لیکن رسمہ۔ اس کے معانی کو سمجھنے اور ان پر غور کرنے کا کبھی موقع نہیں ملا۔ اس لیے میں انہیں اردو کا کوئی آسان سا ترجمہ لا دوں۔ میں نے انہیں دو تین سادہ سادہ سے آسان مترجم قرآن شریف فراہم کر دیئے۔ ان کو انہوں نے بڑی محنت اور غور سے پڑھا۔ بنیادی عقائد' عبادات' نظام کائنات اور قصص القرآن تو وہ آسانی سے سمجھ گئے لیکن زندگی کی کلیت اور مجموعیت کا احکام الٰہی کے ساتھ جو مربوط' مضبوط اور عملی رشتہ ہے وہ پوری طرح ان کے فہم و ادراک کی گرفت میں نہ آ سکا۔ کچھ عرصہ ان کے سر میں یہ سودا بھی سمایا رہا کہ قرآن مجید کو عقائد' عبادات' اخلاقیات' قوانین' تمثیلات' قصص وغیرہ کے عنوانات کے تحت بھی تدوین کر دینی چاہیے تاکہ ہر موضوع کے حوالہ جات تلاش کرنے میں آسانی ہو۔ اس خیال میں کچھ ایسے عناصر کی ہمت افزائی کرتے رہتے تھے جو دین کو انضباطی پابندیوں سے آزاد کر کے اسے سہل انگاریوں اور تن آسانیوں کے سانچے میں ڈھالنے کی کوشش میں لگے رہتے ہیں۔ جس طرح امتحان پاس کرنے کے لیے کتابوں کے خلاصے اور پاکٹ گائیڈ مقبول ہوتے ہیں' اسی طرح اسلام کا یہ نظرثانی شدہ آسان رنگ بھی صدر ایوب کو بڑی آسانی سے متاثر کر دیتا تھا۔ لیکن عام طور پر یہ تاثر عارضی ہوتا تھا۔ کیونکہ بنیادی طور پر وہ ایک اچھے اور سیدھے سادے مسلمان تھے۔

۱۹۶۰ء میں جب وہ سعودی عرب کے سرکاری دورے پر جا رہے تھے تو عمرہ ادا کرنے کے لیے انہوں نے خاص طور پر تیاری کی۔ ان کی فرمائش پر میں نے انہیں مختلف دعاؤں کے مجموعے دیئے' جن کا انہوں نے چند روز خوب مطالعہ کیا۔ جس روز روانگی کے لیے ہم ہوائی جہاز میں سوار ہوئے' انہوں نے دونوں مجموعے واپس کر دیئے' اور کہا۔ "مجھے

For more books visit www.4Urdu.com

اپنے مطلب کی چیز مل گئی ہے۔ اب زیادہ لمبی چوڑی دعائیں یاد کرنے کی ضرورت نہیں۔"

میرے استفسار پر انہوں نے جیب سے کاغذ کا ایک پرزہ نکالا' جس پر ایک مختصر سی دعا اردو ترجمہ کے ساتھ نقل کی ہوئی تھی۔ اس کا مفہوم یہ تھا کہ یااللہ مجھے بغیر حساب کتاب کے ہی بخش دے!

مکہ معظمہ میں ایک روز ان کے لیے خانہ کعبہ بھی کھولا گیا۔ جب ہم اندر داخل ہوئے تو شاہی معلم نے کہا کہ چاروں طرف منہ کر کے دو دو رکعت نماز پڑھ لیں۔ یہ سنت پوری کرنے کے بعد صدر ایوب بڑے شاداں و فرحاں نظر آتے تھے۔ وہیں اندر کھڑے کھڑے انہوں نے مجھے بتایا کہ چاروں طرف سجدہ کر کے انہوں نے اللہ تعالیٰ سے یہ دعا بھی مانگی ہے کہ ہندوستان کے سامنے ہمارا سر خم نہ ہو۔ بیت اللہ شریف کے اندر مانگی ہوئی دعا کبھی رائیگاں نہیں جاتی۔ ۱۹۶۵ء کی جنگ اس کا کھلا ثبوت ہے۔

مدینہ منورہ میں ہمیں روضہ رسول کے حجرہ مبارک کے اندر جانے کی سعادت بھی نصیب ہوئی۔ اندر داخل ہوتے ہی صدر ایوب پر ہیبت اور رقت طاری ہو گئی۔ لمحہ بھر کے لیے انہوں نے دونوں ہاتھوں سے روضہ اطہر کا غلاف تھام لیا اور ان کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے۔ زندگی بھر میں نے انہیں صرف ایک بار اس طرح اشک بار دیکھا ہے۔

صدارت کا کام جنرل ایوب خاں نے بڑی محنت' لگن' باقاعدگی اور سلیقے سے شروع کیا۔ سب فائلیں وہ غور سے پڑھتے تھے اور ان پر احکامات بھی اپنے ہاتھ سے لکھتے تھے۔ روز کی فائلیں روز نپٹا دیتے تھے۔ کچھ دن میں' کچھ رات کے وقت۔ کبھی ایسا نہیں ہوا کہ کوئی فائل اگلے روز کے لیے اٹھا رکھی ہو۔ ہر روز اپنی ڈاک بھی پوری دیکھتے تھے۔ کچھ خطوط خود جواب دینے کے لیے منتخب کر لیتے تھے' باقی میرے حوالے کر دیتے تھے۔ اس زمانے میں صدر کے نام جتنے خط آتے تھے ان سب کے جواب ضرور دیئے جاتے تھے۔

ایک رو پنجاب کے کسی گاؤں سے ایک دل جلے کا خط آیا' جس میں بڑی سخت زبان

For more books visit www.4Urdu.com

استعمال کی ہوئی تھی اور کچھ گالی گلوچ بھی تھی۔ اس شخص کا کوئی چھوٹا سا معاملہ محکمہ مال میں اٹکا ہوا تھا اور کئی بار رشوت ادا کرنے کے بعد بھی سلجھنے میں نہ آتا تھا۔ اس نے دھمکی دی تھی کہ اگر اس کے ساتھ انصاف نہ ہوا تو وہ ساری عمر صدر ایوب کو بددعائیں دے دے کر مرے گا۔ میرے عملے نے بہت کہا کہ اس قسم کا خط صدر کو نہ دکھایا جائے کیونکہ اسے پڑھ کر وہ خواہ مخواہ غصے میں آئیں گے یا پریشان ہوں گے۔ لیکن میں نے اس خط کو ان کی خدمت میں اس تجویز کے ساتھ پیش کیا کہ اس کا جوب خود صدر مملکت دیں۔ لاہور کے اگلے دورے میں اس شخص کو گورنر ہاؤس میں طلب کر کے اس کی بات سنی اور اس کا معاملہ گورنر کے سپرد کر کے جب تک وہ انجام تک پہنچ جائے اس کا پیچھا نہ چھوڑیں۔ یہ تجویز صدر ایوب کو پسند آ گئی اور اس پر عمل کر کے انہوں نے وقتاً فوقتاً مشرقی اور مغربی پاکستان میں بہت سے چھوٹے چھوٹے لوگوں کے چھوٹے مسائل حل کرنے میں بڑی مدد دی۔

صدر ایوب کا گھریلو ماحول بھی بڑا سادہ اور خوشگوار تھا۔ بیگم ایوب خاموش طبع' مرنجان مرنج اور پروقار خاتون تھیں۔ ملک کی خاتون اول کے طور پر انہوں نے کبھی ذاتی پبلسٹی حاصل کرنے کی کوشش نہیں کی۔ اپنے بیٹوں کے لیے تو بڑی کمزور ماں ثابت ہوئیں کیونکہ وہ ان میں سے بعض کی خطا کاریوں اور ناپسندیدہ حرکات پر بڑی محنت سے پردہ ڈالتی رہتی تھیں۔ لیکن بیٹیوں کی تربیت پر ان کا اثر بے حد خوشگوار تھا۔ صدر ایوب کی صاحبزادیاں حسن صورت اور حسن سیرت دونوں سے مالا مال تھیں اور ان کے کردار میں حیاداری اور خوش اخلاقی کا بڑا گہرا امتزاج تھا۔ گھر کے اندر بھی وہ کبھی اپنے والد کے سامنے ننگے سر نظر نہ آتی تھیں۔ ان میں سے کسی نے میری بیوی کو بتایا تھا کہ کبھی کبھی وہ دوپٹے کو بالوں کے ساتھ پنوں کے ذریعہ ٹانک کر رکھتی ہے تاکہ بے خیالی میں سرک کر سر سے اتر نہ جائے۔

صدر ایوب کی سب سے چھوٹی صاحبزادی شکیلہ کی شادی ہوئی تو سادگی میں یہ تقریب بھی

For more books visit www.4Urdu.com

اپنی مثال آپ تھی۔ راولپنڈی سے ان کے ساتھ پرسنل سٹاف کے فقط ہم چار پانچ آدمی ان کے گاؤں ریحانہ گئے۔ ان کے آبائی مکان کے ایک کھلے احاطے میں درختوں کی چھاؤں میں چند کرسیاں اور کچھ چارپائیاں بچھی ہوئی تھیں۔ وہاں بیٹھ کر ہم نے برات کا استقبال کیا۔ نکاح کے بعد کھانا ہوا اور انتہائی سادگی کے ساتھ رخصتی ہو گئی۔ اس تقریب میں صرف گاؤں کے کچھ احباب اور برادری کے لوگ شریک ہوئے۔ نہ باجا گاجا۔ نہ ڈھول دھمکا۔ نہ تحفے تحائف۔ جس سادگی سے شادی کی تقریب ہوئی تھی' اسی سادگی سے ہم نے اخبار میں ایک چھوٹی سی دو سطری خبر چھپوا دی۔ ٹی۔ وی کا دور تو ابھی نہ آیا تھا' لیکن ریڈیو پاکستان کے کسی بلیٹن میں اتنی سی خبر بھی نہ آئی۔ یہ دیکھ کر چند وزیر' افسر اور پیشہ ور خوشامدی صدر ایوب کے سر ہو گئے کہ اس سادہ تقریب کی خاطر خواہ پبلسٹی نہ ہونے کی وجہ سے ان کا "امیج" بڑھانے کا ایک سنہری موقعہ ہاتھ سے نکل گیا ہے۔ یہ بات ان کے کانوں میں بار بار اتنی شدت سے بھری گئی کہ رفتہ رفتہ وہ بھی تذبذب کے عالم میں مبتلا ہو گئے۔ ایک روز میں کسی کام سے ان کے پاس گیا' تو ایک ایسا ہی خوشامدی ٹولہ انہیں اپنے نرغے میں لیے بیٹھا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی وہ لوگ پنجے جھاڑ کر میرے پیچھے بھی پڑ گئے کہ صدر مملکت کے "امیج" کو فروغ دینے کا ایسا اچھا موقعہ کیوں ضائع کر دیا۔ میں خاموشی سے کھڑا ہوا ان کی چخ چخ بک بک سنتا رہا۔ جب ان کا غوغا بند ہوا' تو میں نے اپنے الفاظ کو قلفی کی طرح برف میں جما کر بڑے ادب سے کہا۔ "اگر اس موقع پر آپ صاحبان بھی مدعو ہوتے تو آپ کو بھی ضرور محسوس ہوتا کہ اس تقریب کی سادگی میں بڑا خلوص تھا۔ اب اسے اشتہاری سٹنٹ میں تبدیل کرنا کسی طرح بھی مناسب نہیں بلکہ خلوص میں ریا کی کھوٹ ملانا بے برکتی کا باعث بن جاتا ہے۔"

میری بات تو غالباً کسی کو پسند نہ آئی۔ لیکن اتنا فائدہ ضرور ہوا کہ اس موضوع پر مزید چوں چوں بند ہو گئی۔

For more books visit www.4Urdu.com

دفتر کے اندر دفتر کے باہر صدر ایوب کے سر پر ہمیشہ کام کی دھن سوار رہتی تھی۔ صدارت کا عہدہ سنبھالنے کے بعد مجھے ان کو کافی عرصہ تک کسی قدر قریب سے دیکھنے کا موقع ملا ہے۔ میں نے انہیں کبھی ایسی باتوں میں زیادہ وقت ضائع کرتے نہیں پایا جن کا تعلق کسی نہ کسی طرح کام کے کسی نہ کسی شعبے سے نہ ہو۔ ان کے پاس ہمیشہ ایک نوٹ بک رہتی تھی' جس میں وہ تاریخ ڈال کر ہر وہ بات درج کرتے جاتے تھے' جو اس روز ان کو خود سوجھتی تھی' یا کسی سے سنتے تھے' یا کہیں پڑھ لیتے تھے۔ ہر اندراج کا نمبر شمار بھی لکھا جاتا تھا' جو نوٹ بک کے شروع سے آخر تک مسلسل چلتا تھا۔ اس طرح درج شدہ باتوں کو وہ کابینہ کے اجلاس' یا گورنروں یا وزیروں یا افسروں کے ساتھ اٹھاتے تھے اور جب ان پر عملدرآمد ہو جاتا تھا تو اس پر نشان لگا دیتے تھے۔ شروع کے دو برس ان کی جو نوٹ بک ختم ہوتی تھی' اسے میں اپنے پاس لے کر رکھ لیتا تھا۔ میرے پاس اس قسم کی چار کاپیاں محفوظ ہیں۔ ان سب کو ملا کر ان کے اندراجات کی تعداد ۱۲۵ ہے۔ یہ سطور لکھنے کے لیے میں نے ان کا کسی قدر غور سے جائزہ لیا' تو ملکی امور کے چھوٹے سے چھوٹے اور بڑے سے بڑے بے شمار معاملات پر ان کا تفصیلی عبور دیکھ کر بے ساختہ داد دینے کو جی چاہا۔ گورنروں کی تقرریاں' وزیروں کے دورے' سفیروں سے گفتگو' امریکن ایڈ' نمایاں قابلیت کے چھوٹے بڑے افسروں کی نشاندہی' کسی جگہ کھاد کی سپلائی' کہیں پانی کی کمی' کسی کی پنشن کا معاملہ' سیم اور تھور کے مسائل' افریقہ میں اسلام کی تبلیغ' ریڈیو سے درس قرآن' بین الاقوامی معاملات------ ایسے ایسے بے شمار موضوعات ہیں جن سے یہ چاروں کاپیاں بھری پڑی ہیں۔

ہو حلقہ یاراں تو بریشم کی طرح نرم
ہو رزم حق و باطل تو فولاد ہے مومن

For more books visit www.4Urdu.com


## • صدر ایوب' اصلاحات اور بیوروکریسی

عنان حکومت سنبھالتے ہی صدر ایوب کے سر پر اصلاحات کا بھوت بڑی شدت سے سوار ہو گیا۔ شروع ہی سے انہوں نے اپنے ذہن پر یہ مفروضہ طاری کر لیا تھا کہ پاکستان کے نظام زندگی اور نظام حکومت کا ہر شعبہ بری طرح بگڑا ہوا ہے' اور ان کی اصلاح کرنا ان کا فرض منصبی ہے۔ دل ہی دل میں وہ اپنے آپ کو ایک انقلابی ریفارمر سمجھتے تھے' لیکن درحقیقت ان کی طبیعت کی افتاد انقلاب پسند تھی نہ انقلاب انگیز تھی۔ ان کے کردار میں میانہ روی' اعتدال پسندی' مصلحت اندیشی اور عافیت طلبی کے عناصر اس قدر غالب تھے کہ کسی شعبے میں بھی انقلاب کا کوئی تقاضا پورا کرنا ان کے بس کا روگ نہ تھا۔ بنیادی طور رپ وہ Status quo کے آدمی تھے۔ یہی وجہ ہے کہ اصلاحات کے نام پر وہ معمولی سی چھان پھٹک اور جھاڑ پونچھ کے علاوہ کوئی دور رس کارنامہ سرانجام نہ دے سکے۔ جیسے جیسے ان کے زمانہ اقتدار کی رسی دراز ہوتی گئی۔ ویسے ویسے ان میں احتیاط پسندی کی احتیاج شدت سے بڑھتی گئی۔ صاحب اقتدار اگر اپنی ذات کے گرد خود حفاظتی کا حصار کھینچ کر بیٹھ جائے' تو اس کی اختراعی' اجتہادی اور تجدیدی قوت سلب ہو کر اسے لکیر کا فقیر بنا دیتی ہے۔ خود سلامتی کا بیج کوتیاتی ٹھہراؤ میں جڑ پکڑتا ہے۔ اور تغیر و تبدل کا زیر و بم اس کی نشوونما کو راس نہیں آتا۔ یہی وجہ ہے کہ اصلاحات کا ابتدائی جوش و خروش ملیریا کے بخار کی طرح بڑی تیزی سے چڑھا اور رفتہ رفتہ کہیں بالکل اتر گیا' کہیں مزمن ہو کر رگوں پٹھوں میں بیٹھ گیا۔ اس کے بعد یہ معمول ہو گیا کہ جب کبھی مارشل لاء لگتا ہے۔ یہ خوابیدہ جراثیم نئے سرے سے جوش مارنے لگتے ہیں اور اصلاحات کا شوق باری کے بخار کی طرح کچھ دیر چڑھتا اترتا رہتا ہے اور پھر حسب دستور کہنہ ملیریا کی مانند اگلے موسم تک کے لیے افاقے کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔

For more books visit www.4Urdu.com

صدر ایوب کا رجحان اصلاحات کی طرف مائل دیکھ کر ہماری فرض شناس نوکر شاہی نے بھی اپنی روایتی نبض شناسی کا ثبوت دیا اور بیوروکریسی کے اعلیٰ طبقہ نے آناً فاناً اصلاحات کو ہی اپنا اوڑھنا بچھونا بنا لیا۔ اب جناب صدر جس شعبے کی اصلاح کا بیڑہ اٹھاتے تھے اس شعبے کے نئے اور پرانے افسر اور سرکاری اور نیم سرکاری ماہرین لبیک لبیک کہتے ہوئے آگے بڑھتے تھے اور انہیں لوگوں میں سے کچھ حضرات کا انتخاب کر کے ایک کمیشن یا کمیٹی قائم کر دی جاتی تھی۔ عام طور پر یہ لوگ اپنے اپنے محکمانہ تجربوں' تعصبات' روایات' مفادات اور محرومیوں کی دلدل میں اس قدر دھنسے ہوئے ہوتے تھے کہ ان کا ذہن کسی نئی روش پر سوچنے سے سراسر قاصر تھا۔ سال دو سال کی محنت کے بعد ہر کمیشن یا کمیٹی ایک بھاری بھرکم اور ضخیم رپورٹ مرتب کرتی تھی۔ اس رپورٹ کا ایک نسخہ پیش کشی سنہری حاشیے والی خوبصوت مراکولیدر کی جلد میں سجا کر صدر ایوب کو ایک خصوصی تقریب میں بڑے طمطراق سے پیش کیا جاتا تھا۔ دونوں جانب سے تعریف و توصیف' خیرسگالی اور خوش کلامی کا بڑی فیاضی سے عوض معاوضہ ہوتا تھا اور پھر یہ رپورٹ سیدھی اپنے ہی محکمے میں واپس چلی جاتی تھی' تاکہ جن جن اصلاحات کی سفارش کی گئی ہے' ان پر مزید عمل درآمد شروع کیا جائے۔ یہ عمل اسی طرح کا تھا جیسے بلی کو دودھ کی رکھوالی پر بٹھا دیا جائے۔

اصلاحات کی ناکامی ہو یا کوئی دوسرا منصوبہ ٹوٹ کر بگڑ جائے' اس کی ذمہ داری ہمیشہ بیوروکریسی ہی کے سر تھوپی جاتی ہے۔ سیاستدان اپنی کمزوریوں' کوتاہیوں اور محرومیوں کا الزام بیوروکریسی ہی پر لگاتے ہیں۔ مارشل لاء نازل ہو تو سارے بگاڑ کی وجہ بیوروکریسی کو ہی گردانا جاتا ہے۔ کبھی نوکر شاہی کی تطہیر کے لیے سکریننگ کا عمل ظہور میں آتا ہے۔ کبھی تھوک کے بھاؤ ہزاروں ملازم بغیر کسی انکوائری کے برطرف کر دیئے جاتے ہیں۔ کبھی بیوروکریسی کو راہ راست پر لانے والے افراد چھوٹے بڑے سرکاری ملازموں کی پتلونیں اتار کر انہیں درختوں پر سر کے بل ٹانگ دینے کی دھمکیاں سناتے ہیں۔ ایسے

For more books visit www.4Urdu.com

ماحول میں ہر بار نئے حکمران اپنے آپ کو اللہ کے مقرب فرشتے سمجھتے ہیں' اور نوکر شاہی کے ہر فرد کو ابلیس کا ساتھی قرار دیا جاتا ہے۔

URDU4U.COM

یہ سارے ہتھکنڈے سرکاری ملازمین پر خوف و ہراس کی دھونس جمانے اور عوام پر اپنی برتری کا رعب گانٹھنے کے لیے استعمال کئے جاتے ہیں۔ ورنہ حقیقت تو یہ ہے کہ دنیا کے ہر خطے میں ہر ملک کی بیوروکریسی مملکت کا نظم و نسق چلانے میں ریڑھ کی ہڈی کا درجہ رکھتی ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ بیوروکریسی سول حکومت کی ہوتی ہے' کبھی فوج کی' کبھی سیاسی جماعتوں کی' کبھی کسی مخلوط محاذ کی' لیکن ہر صورت میں بیوروکریسی سے کوئی نظام سلطنت راہ فرار اختیار کرنے کی سکت نہیں رکھتا۔ بیوروکریسی کا نعم البدل بھی بیوروکریسی ہی ہے۔ جمہوری نظام ہو یا آمریت کا دور دورہ' بیوروکریسی دونوں کے حق میں یکساں وفاداری سے کام کرتی ہے۔ یہی اس کا بنیادی فرض اور عملی تربیت کا ثمرہ ہے۔ نوکر شاہی کے فرائض میں حکومتوں یا نظام حکومت کو ادلنا بدلنا شامل نہیں ہے' بلکہ ان کی نافذ کی ہوئی پالیسیوں پر حتی الوسع دیانتداری سے عمل درآمد کرنا ہے۔ حکومت یا نظام حکومت کو بدلنا سیاستدانوں کا حق ہے۔ اگر وہ اپنی بدنظمی یا بے بضاعتی یا انتشار کی وجہ سے یہ حق استعمال کرنے سے قاصر رہیں تو مسلح افواج خود بخود میدان میں اتر آتی ہیں۔ حکومت یا نظام حکومت بدلنے کے اس عمل کو عام طور پر "انقلاب" کا نام دیا جاتا ہے۔ یہ سراسر غلط ہی نہیں' بلکہ لفظ "انقلاب" کی توہین بھی ہے۔ کیونکہ انقلاب ہمیشہ عوام الناس ہی لاتے ہیں۔ مثلاً تحریک پاکستان ایک عوامی انقلاب تھا۔ اس کی کامیابی کے بعد وطن عزیز میں آج تک اور کوئی انقلاب برپا نہیں ہوا۔ صرف حکومتیں تبدیل ہوئی ہیں۔ کبھی سول' کبھی فوجی۔

بیوروکریسی کو پالنا پوسنا فقط سول حکومتوں کی اجارہ داری نہیں' بلکہ ایک پیچ در پیچ عالمگیر دستور کی طرح یہ زندگی کے ہر شعبے میں جاری و ساری ہے۔ سول بیوروکریسی کسی تعارف کی محتاج نہیں۔ مسلح افواج میں ان کی اپنی بیوروکریسی چلتی ہے۔ عدلیہ کے نظام میں اس

For more books visit www.4Urdu.com

کی بیوروکریسی کا اپنا رنگ ہوتا ہے۔ سیاستدانوں کی جماعتوں میں ان کی اپنی بیوروکریسی رائج ہے۔ نیم سرکاری اداروں' بینکوں' بڑی صنعتوں' تجارتی کمپنیوں اور دیگر مینجمنٹ گروپوں میں بھی ان سب کی اپنی اپنی مخصوص بیوروکریسی کا راج ہے۔ سول بیوروکریسی کے علاوہ باقی سب بیوروکریسیاں پردہ نشین بی بیاں ہیں۔ اس لیے ان کا نام لینے کا رواج نہیں' البتہ سول بیوروکریسی کی نہ صرف تعداد بہت زیادہ ہے' بلکہ اس کا رابطہ عوام الناس سے بھی ہمہ وقت براہ راست رہتا ہے۔ باہمی خیر سگالی کا جذبہ کارفرما ہو' تو اس رابطہ سے خوش حالی اور امن آشتی اور ترقی کے چشمے پھوٹتے ہیں۔ ٹکراؤ کی صورت میں چقماق کی رگڑ کی طرح اسی رابطہ سے حسد اور بغض اور کشاکشی کی چنگاریاں چھوٹتی ہیں' رشوت خوری بددیانتی' بداخلاقی' خویش پروری' اقربانوازی اور ناانصافی کے جرائم کا ارتکاب ساری بیوروکریسی تو نہیں کرتی۔ لیکن کلنک کا ٹیکہ اس کی اجتماعی پیشانی پر یکساں لگ جاتا ہے۔

سول بیوروکریسی کے جملہ خصائل پر تبصرہ کرنا جوئے شیر لانے سے کم نہیں' کیونکہ اس میں ہر رنگ ڈھنگ' ہر چلن اور ہر انداز کے افراد پھلتے پھولتے ہیں' لیکن ایک خصوصیت جوان میں مشترک ہے یہ ہے کہ چھٹتی نہیں ہے منہ سے یہ کافر لگی ہوئی۔

بیوروکریسی کا نشہ ایسا نہیں جسے ترشی اتار دے۔ خاص طور پر جس بیوروکریٹ پر وی آئی پی کے تین حرف پڑ جائیں' وہ دھوبی کے کتے کی طرح نہ گھر کا رہتا ہے نہ گھاٹ کا۔ یہ تین حرف صرف سول بیوروکریسی کی ذات ہی نہیں بگاڑتے' بلکہ مسلح افواج' عدلیہ اور سیاسی بیوروکریسیوں پر بھی یکساں اثر انداز ہوتے ہیں۔ جس شخص کا قدم ایک بار وی آئی پی کی شاہراہ پر پڑ گیا' بعد میں وہ کسی عام رہگزر پر گامزن ہونے سے بڑی حد تک ناکارہ ہو جاتا ہے۔ خاص طور پر ہوائی اڈوں کے VIP Lounge دیکھ کر یہی محسوس ہوتا ہے کہ کوڑھیوں کے لیے ایک الگ احاطہ قائم کیا گیا ہے جس میں وہ باقی مخلوق کی نظروں سے پوشیدہ رکھے جا سکیں۔ سربراہان مملکت اور غیر ملکی اکابرین کے لیے وی آئی پی لاؤنج استعمال کرنا تو واجب اور مناسب ہے۔ لیکن اپنے وطن کے وزیروں'

For more books visit www.4Urdu.com

سفیروں اور اعلیٰ افسروں کو اپنے ہی ہم وطن عوام سے کاٹ کر چھوت چھات کے مریضوں کی طرح خصوصی لاؤنج میں محبوس کرنا باعث شرم ہے۔ اگر یہ حضرت بھی عام لاؤنجوں سے گزریں تو لازم نہیں کہ عوام الناس کے دوش بدوش چل کر ان کی ناک کٹ جائے گی۔ البتہ وی آئی پی کا لبادہ اوڑھ کر ان کے دماغ کا ٹیڑھا ہو جانا زیادہ قرین قیاس ہے۔ وی آئی پی کو برہمن اور عوام کو شودر کا درجہ دینا اسلامی اخوت اور مساوات کے تقاضوں کی تذلیل کے مترادف ہے۔

میں نے اپنی تیس سالہ ملازمت کے دوران وی آئی پی لاؤنج فقط چند بار استعمال کی ہے۔ وہ بھی کبھی' اپنے پی۔ اے کا دل رکھنے کے لیے اور کبھی اپنے پرائیویٹ سیکرٹری کے رعب میں آ کر اسی طرح کے دباؤ میں آ کر ایک بار میں کراچی کے وی آئی پی لاؤنج میں جا بیٹھا۔ لیکن لاؤنج کے پروٹوکول افسر کو میری ذات میں وی آئی پی کی خصوصیت نظر نہ آئی۔ وہ جھپٹ کر میرے پاس آیا' اور رشک و شبہ سے لبریز لہجے میں پوچھنے لگا۔

"کیا آپ وی آئی پی ہیں؟"

میں نے شرماتا کہا' "وہ کیا بلا ہے؟"

"Very Important Person" اس نے ایک ایک لفظ چبا چبا کر میرے علم میں اضافہ کیا۔

"جی نہیں' میں تو اپنے کو ایسا نہیں سمجھتا۔" میں نے اقبال جرم کیا۔

"پھر آپ یہاں کیوں آ گئے؟ عوامی لاؤنج میں تشریف لے جائیں۔" افسر نے حکم دیا۔

میں تو تعمیل حکم کے لیے تیار ہو گیا' لیکن عین اس وقت میرا پی۔ اے آڑے آ گیا۔ معلوم نہیں کہ اس نے پروٹوکول افسر سے کیا بات چیت کی کہ وہ بیچارہ مجوب سا ہو کر میرے پاس آیا' اور بولا۔ "سر' میں معافی کا خواستگار ہوں۔ آپ نے اپنی اصلیت چھپا کر مجھے بیحد شرمندہ کیا۔"

میں نے جواب دیا۔ "بھائی کون وی آئی پی اور کہاں کا وی آئی پی؟ شرمندگی تو ان

For more books visit www.4Urdu.com

حضرات کو لاحق ہونا چاہیے' جو اپنے آپ کو سچ مچ وی آئی پی سمجھ بیٹھتے ہیں۔"
یہ سن کر نوجوان افسر مسکرایا' اور بولا۔ "جناب آپ کس دنیا کی بات کر رہے ہیں۔
اب تو وی آئی پی بھی کسی شمار قطار میں نہیں رہے' کیونکہ انکے سر پر وی وی آئی
پی کا درجہ بھی مسلط ہو گیا ہے!"
Very Very Important Person
کون کہتا ہے کہ بیوروکریسی کے سائے تلے وطن عزیز تیز رفتاری سے روز افزوں ترقی کی
راہ پر گامزن نہیں؟
اپنی اصلاحات کو نافذ کرنے کے لیے صدر ایوب نے جو کمیشن اور کمیٹیاں قائم کیں' ان
کی تفصیل درج ذیل ہے۔

○ اصلاحی کمیشنوں کی فہرست

(۱) زرعی اصلاحات کمیشن
(۲) جہاز رانی کمیشن
(۳) اصلاح قانون کمیشن
(۴) انتظامیہ کی تنظیم نو کے لیے کمیٹی
(۵) کمیشن برائے قومی تعلیم
(۶) صدر مقام کے محل وقوع کی کمیٹی
(۷) تحقیقاتی کمیشن برائے قرضہ جات
(۸) غذائی و زرعی کمیشن
(۹) سائنس کمیشن
(۱۰) تنخواہ و ملازمت کمیشن
(۱۱) کمپنی قانون کمیشن

For more books visit www.4Urdu.com

(۱۲) طبی اصلاحات کمیشن

(۱۳) کھیل، ثقافت اور نژاد نو کی کمیٹیاں

(۱۴) پولیس کمیشن

(۱۵) آئین کمیشن

(۱۶) قیمتوں کی تعین کا کمیشن

(۱۷) فلمی معلوماتی کمیشن

URDU4U.COM

(۱۸) فالتو افرادی طاقت کمیشن

(۱۹) سماجی برائیوں کا کمیشن

(۲۰) برقی طاقت کا کمیشن

(۲۱) مالیاتی کمیشن

(۲۲) قرضہ جاتی کمیشن

(۲۳) رائے دہی کی کمیشن

(۲۴) قومی آمدنی کمیشن

(۲۵) قومی مالیات کمیشن

(۲۶) اقلیتوں کا کمیشن

(۲۷) نشریاتی کمیشن

(۲۸) پریس کمیشن (یہ بہت پہلے قائم ہو چکا تھا لیکن اس کی رپورٹ مئی ۱۹۵۹ء میں موصول ہوئی۔)

(۲۹) شکر کمیشن (یہ بھی پہلے قائم ہو چکا تھا، لیکن رپورٹ اگست ۱۹۵۹ء میں موصول ہوئی)

(۳۰) شادی و عائلی قانون کمیشن۔

(یہ کمیشن ۱۹۵۴ء میں قائم ہوا تھا۔ اس کی رپورٹ بھی ۱۹۵۶ء میں موصول ہو چکی تھی لیکن اس پر عمل درآمد مارچ ۱۹۶۱ء میں ہوا)

For more books visit www.4Urdu.com

- صدر ایوب اور ادیب

جب مارشل لاء نافذ ہوا' تو مارشل لاء لگتے ہی ایک روز صبح سویرے قرہ العین حیدر میرے ہاں آئی۔ بال بکھرے ہوئے' چہرہ اداس' آنکھیں پریشان ------- آتے ہی بولی' "اب کیا ہو گا؟"

URDU4U .COM

"کس بات کا کیا ہو گا؟" میں نے وضاحت طلب کی۔

"میرا مطلب ہے اب ادبی چانڈو خانوں میں بیٹھ کر (Loose Talk) کرنا بھی جرم ٹھہرا۔

"ہاں" میں نے کہا۔ "گپ شپ بڑی آسانی سے افواہ سازی کے زمرے میں آ کر گردن زدنی قرار دی جا سکتی ہے۔"

"تو گویا بھونکنے پر بھی پابندی عائد ہے؟" عینی نے بڑے کرب سے پوچھا۔

میں نے مارشل لاء کے ضابطے کے تحت بھونکنے کے خطرات و خدشات کی کچھ وضاحت کی' تو عینی کی آنکھوں میں آنسو تیرنے لگے۔ آنسو چھپانے کے لیے اس نے مسکرانے کی کوشش کی' اور ایک ٹھنڈی آہ بھر کر کسی قدر لا پروائی سے کہا۔ "ارے بھئی' روز روز کون بھونکنا چاہتا ہے۔ لیکن بھونکنے کی آزادی کا احساس بھی تو ایک عجیب نعمت ہے۔"

میرا اندازہ ہے کہ قرہ العین حیدر کے تحت الشعور نے اس روز اس لمحے پاکستان سے کوچ کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ وہ کوئی باغیانہ خیالات کی لڑکی نہ تھی اور نہ ہی اس کے قلم کی روشنائی میں تخریب پسندی' فحاشی' تلخی اور بے راہ روی کی کالک تھی۔ "میرے بھی صنم خانے" کی مصنفہ زندگی کی چلبلاہٹوں' ہلکی پھلکی رنگینیوں' رعنائیوں' فلرٹیشنوں' ثقافتی تصادموں' سماجی بوکھلاہٹوں اور دل اور دماغ کی فسوں کاریوں میں کچھ حقیقی' کچھ افسانوی' کچھ رومانوی رنگ بھرنے کی ملکہ تھی' لیکن سنسر شپ کے تخیل ہی سے اس کو بڑا شدید ذہنی جھٹکا لگا۔ کچھ عجب نہیں' اسی جھٹکے کے ردعمل نے اس کے قلم کی

For more books visit www.4Urdu.com

باگ "آگ کا دریا" کی طرف موڑ دی ہو۔

اس کے چند ہفتوں بعد ایک روز میں اپنے دفتر میں بیٹھا کام کر رہا تھا کہ اچانک قرہ العین حیدر' جمیل الدین عالی' غلام عباس' ابن الحسن' ابن سعید اور عباس احمد عباسی تشریف لے آئے۔ باتوں باتوں میں انہوں نے کہا آج کل ہر محفل میں گفتگو کا رخ مارشل لاء کی طرف مڑ جاتا ہے۔ ادیبوں میں بھی اس موضوع پر مختلف النوع خیال آرائیاں ہوتی رہتی ہیں۔ چند دوستوں کی رائے ہے کہ اب تک ہمارے ملک میں ادیبوں کی فلاح و بہبود کے لیے نہ کسی نے سوچا ہے نہ کبھی کچھ کیا ہے۔ آج کل جب کہ یہ فوجی حکومت زندگی کے ہر شعبے میں تطہیر و تعمیر' ترقی و بہبود کے نت نئے اعلان کرتی جا رہی ہے' تو موقع ہے کہ اس بات کو آزما دیکھیں کہ حکومت کے بلند بانگ دعوؤں میں ادیبوں کی ویلفیئر کے لیے بھی کوئی گنجائش نکل سکتی ہے یا نہیں؟ انہوں نے مزید بتایا کہ بپائے اردو کی موجودگی میں بھی یہ تذکرہ آ چکا ہے اور وہ بھی اس قسم کی کوشش کر دیکھنے کے حق میں مائل نظر آتے ہیں۔

جمیل الدین عالی نے فرمایا کہ آج ہم لوگ یہاں اس سلسلے میں آپ کے ساتھ مشورہ کرنے آئے ہیں۔

اس بات پر مجھے کچھ ہنسی آئی۔ یہ حضرات جو میرے سامنے بیٹھے تھے۔ علم و ادب کی دنیا میں اپنا اپنا نمایاں مقام رکھتے تھے۔ اس لحاظ سے ان کے سامنے میری کوئی خاص حیثیت نہ تھی کہ وہ میرے پاس کسی بات میں مشورہ کرنے آئیں۔ ظاہر ہے کہ وہ میرے پاس صرف یہ ٹوہ لگانے آئے تھے کہ اس قسم کی تجویز پر مارشل لاء کی حکومت کا رد عمل کیا ہو گا۔ میرے خیال میں یہ سعی حاصل تھی۔ کیونکہ نئے فوجی حکمران میرے لیے بھی اسی قدر اجنبی تھے۔ جس قدر کہ ان لوگوں کے لیے میرے دل میں بھی یہ دھڑکا لگا ہوا تھا کہ نہ معلوم مارشل لاء کی پٹاری سے کس وقت کوئی ایسا ضابطہ برآمد ہو جائے' جو ادب اور ادیب کی آزادی کو سنسر شپ کی زنجیروں میں بری طرح

For more books visit www.4Urdu.com

جکڑ کر رکھ دے اس نامعلوم خدشے کے پیش نظر یہ بات میرے دل کو لگی کہ اگر ادیبوں کی برادری کسی طرح منظم ہو سکے' تو ممکن ہے کہ یہ اس کی خود حفاظتی کے لیے ایک موثر ڈھال ثابت ہو سکے۔ اس کے علاوہ اگر حکومت کسی وقت واقعی علم و ادب کے شعبوں میں فلاح و بہبود کے کسی منصوبے کا ڈول ڈالے' تو ادیبوں کی ایک اجتماعی تنظیم اس کی وصول یابی اور پیش رفت کے لیے پہلے ہی سے عالم وجود میں موجود ہو۔

URDU4U.COM

کسی قدر بحثا بحثی کے بعد بات اس پر ختم ہوئی کہ سب سے پہلے پاکستان بھر کے ادیبوں کی ایک کنونشن منعقد کی جائے' اور اس میں سب کی متفقہ رائے سے اس سلسلہ میں کوئی اگلا قدم اٹھایا جائے۔

چند روز بعد یہی حضرات دوبارہ تشریف لائے' اور اپنے ساتھ ایک اعلان کا مسودہ بھی لائے جو انہوں نے ادیبوں کی کنونشن بلانے کے متعلق تیار کر رکھا تھا۔ یہ اعلان ۴ دسمبر ۱۹۵۸ء کو آٹھ کنوینرز کے دستخطوں سے جاری کیا گیا۔ دستخط کرنے والوں میں میرے علاوہ ابن الحسن' ابن سعید' جمیل الدین عالی' ضمیرالدین احمد' عباس احمد عباسی' غلام عباس اور قرہ العین حیدر شام تھے۔ کنونشن بلانے کا ابتدائی کام مبلغ ۱۸۰ روپے کی خطیر رقم سے شروع ہوا' جو آٹھ کنوینروں نے بیس روپیہ فی کس چندہ دے کر جمع کی تھی۔ ان کے علاوہ بیس روپیہ کا چندہ شاہد احمد دہلوی نے ڈالا تھا' جو کنونشن کی استقبالیہ کمیٹی کے صدر مقرر کئے گئے تھے۔

اعلان کا شائع ہونا گویا سر منڈاتے ہی اولے پڑنے کے مترادف تھا۔ کچھ ادیبوں کو گلہ تھا کہ یہ آٹھ افراد خود بخود ہی کیوں کنونشن بلانے کے خدائی فوجدار بن بیٹھے ہیں؟ کسی کو شبہ تھا کہ فوجی حکومت کے اشارے پر ایک نئے مافیا نے سر اٹھایا ہے تا کہ وہ دانشوری کے سب انڈوں کو ایک ٹوکری میں جمع کر کے مارشل لاء کی جھولی میں ڈال دے جن شکوک و شبہات کو سب سے بڑی تقویت اس وجہ سے ملتی تھی کہ میں اس زمانے میں صدر مملکت اور چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر کا سیکرٹری بھی تھا۔ چنانچہ ۴ دسمبر

For more books visit www.4Urdu.com

کے اعلان میں میرا نام کچھ اس طرح کھٹکتا تھا' جس طرح آئینہ خانے میں ایک بھٹکا ہوا سانڈ آ گھستا ہے۔ میرے لیے بڑا آسان تھا کہ ان شکوک کے ازالہ کے لیے میں اس سارے کاروبار سے دستبردار ہو کے الگ ہو جاتا' لیکن اپنے گرد و پیش کا جائزہ لے کر میں نے نہایت ایمان داری سے یہی سوچا کہ اتفاق سے آج کل میں جس سرکاری عہدے پر متعین ہوں' تو ادیبوں کی تنظیم کے سلسلے میں اگر اس کا اثر و رسوخ کسی طرح کام میں آ سکتا ہے' تو ضرور کام میں لانا چاہیے۔ اب تقریباً ۲۴ برس کے بعد پیچھے کی طرف دیکھتا ہوں' تو مجھے یقین ہو جاتا ہے کہ میرا فیصلہ صحیح تھا۔ ہر زمانے اور ماحول کے نشیب و فراز میں میں نے پاکستان رائٹرز گلڈ کی جو تھوڑی بہت خدمت کی ہے' اس پر مجھے ہمیشہ فخر رہے گا۔ خدمت گزاری کے اس جذبہ میں کسی وقت بھی کوئی ایسی مقصدیت شامل نہیں تھی جو ادب اور ادیب کی شرافت اور شان کے منافی ہو۔ یہ دوسری بات ہے کہ کچھ لوگوں کے دل میں غلط فہمیاں پہلے بھی موجود بھیں اور غالباً اب تک موجود ہیں۔ خدا جانے غلط فہمیوں کی یہ دھند کبھی دور بھی ہو گی یا نہیں۔ میری صفائی میں صرف گلڈ کا کھلا ریکارڈ ہے جو سب کے سامنے موجود ہے۔ اس کے علاوہ میرا ضمیر ہے جو میرے اور میرے اللہ کے سامنے ہے۔ ان دونوں کے پیش نظر مجھے ہرگز کوئی شرمندگی لاحق نہیں ہے۔

۴ دسمبر کے اعلان کے بعد شاہد احمد دہلوی' جمیل الدین عالی اور عباس احمد عباسی اپنے چند دوسرے رفقاء کے ساتھ کنونشن کی تیاریوں میں اس طرف مصروف ہو گئے۔ جو انہی کا حصہ تھا۔ خاص طور پر جمیل الدین عالی کی لگن' انتھک محنت اور نہایت اعلیٰ درجہ کی انتظامی صلاحیتوں سے ہم سب انتہائی متاثر اور مرعوب ہوئے۔ ان کی دن رات کی لگاتار کوشش اور جدوجہد سے آخر ۲۹' ۳۰' اور ۳۱ جنوری ۱۹۵۹ء کو کل پاکستان رائٹرز کنونشن کراچی میں منعقد ہوئی۔

کنونشن میں ۲۱۲ ادیب شریک ہوئے جن میں ۶۰ مشرقی پاکستان سے آئے تھے۔ ملک بھر میں یہ پہلا موقع تھا کہ ہر علاقے اور ہر زبان کے ادیبوں کی اتنی تعداد ایک پلیٹ

For more books visit www.4Urdu.com

فارم پر جمع ہوئی تھی۔ "ہمچوما دیگرے نیست" پر یقین رکھنے والے احساس' جذباتی' جوشیلے' بے چین اور زودرنج افراد کا اتنا بڑا اجتماع طرح طرح کے تناؤ' کھچاؤ' کشاکشی اور باہمی شکر رنجیوں سے خالی نہ تھا' لیکن مجموعی طور پر سب مندوبین نے کنونشن کی کاروائی میں بھرپور حصہ ر کا اتفاق رائے سے پاکستان رائٹرز گلڈ کی بنیاد ڈالی دی۔ کنونشن کا کام جن خطوط پر آگے بڑھا' وہ کچھ اس طرح تھے:

۲۹ جنوری پہلی نشست (صبح) ۲۱۲ مندوبین کے جی اے ہال کراچی میں جمع ہوئے۔ پروفیسر مرزا محمد سعید دہلوی نے افتتاحیہ تقریر کی۔ جسیم الدین نے صدارت سنبھالی۔ شاہد احمد دہلوی نے خطبہ استقبالیہ پڑھا' اور آٹھ ابتدائی کنوینروں کی جماعت ختم کر دینے کا اعلان کر کے باقی ساری کارروائی مندوبین کی صوابدید پر چھوڑ دی۔

حفیظ جالندھری کی تحریک پر مندوبین نے جمیل الدین عالی کو سٹیج سیکرٹری نامزد کیا۔

دوسری نشست (سہ پہر) حامد علی خان صدر جلسہ منتخب ہوئے۔ اسٹیرنگ کمیٹی کی تشکیل پر بحث اور ۵۶ ادیبوں پر مشتمل اسٹیرنگ کمیٹی کا انتخاب۔ نو نو ادیبوں پر مشتمل سات ذیلی کمیٹیاں منتخب ہوئیں۔ پہلی کمیٹی ادارہ منصفین پاکستان کے قیام اور اس کے دستور کی تشکیل کے متعلق۔ دوسری ادیبوں کی بہبود اور تحفظ حقوق۔ تیسری پاکستانی ادیبوں کے داخلی و خارجی مسائل کا مطالعہ اور سفارشات۔ چوتھی کمیٹی کاپی رائٹ قانون اور مصنف اور ناشر کے باہمی امور۔ پانچویں کمیٹی۔ ادیبوں کے دارالاشاعت کا قیام۔ چھٹی کمیٹی قومی اور علاقائی زبان و ادب کی ترویج و ترقی۔ ساتویں کمیٹی۔ متفرقات اور رابطہ۔

۲۸۹۶ قراردادیں جو اطراف ملک سے موصول ہوئی تھیں' ان منتخب شدہ ذیلی کمیٹیوں کے سپرد کر دی گئیں۔

۳۰ جنوری۔ کمیٹیوں کی کارروائی تاشب۔

سہ پہر۔ اسٹیرنگ کمیٹی کا اجلاس۔ اس کے سامنے کمیٹیوں کی منظور شدہ تجاویز پیش ہوئیں۔ ان پر بحث ہوئی اور ترمیمات کی گئیں۔ چند ذیلی کمیٹیوں کا کام جاری رہا۔

For more books visit www.4Urdu.com

۳۱ جنوری۔ پہلی نشست۔ بیگم یوسف جمال حسین صدر منتخب ہوئیں۔

(صبح) گلڈ کے دستور کا مسودہ اجلاس عام کے سامنے پیش ہوا جس پر بحث ہوئی۔ سہ پہر تک تمام قرار دادیں منظور ہو گئیں۔

URDU4U.COM

ساڑھے تین بجے ۳۱ جنوری ۱۹۵۹ء سے ۲۴ اپریل ۱۹۶۰ء تک کے لیے مرکزی مجلس عاملہ کے عبوری انتخاب ہوئے' جس کا نتیجہ یہ تھا:

مرکزی عہدیداران

سیکرٹری جنرل------ قدرت اللہ شہاب

اعزازی خازن------ عبدالعزیز خالد

اعزازی افسر رابطہ------ جمل الدین عالی

حلقہ کراچی سے -------

جمیل جالبی

شاہد احمد دہلوی

شوکت صدیقی

غلام عباس

قرہ العین حیدر

ابن سعید علاقائی معتمد

طفیل احمد جمالی

حلقہ مغربی پاکستان سے-------

احمد راہی

اعجاز بٹالوی

امیر حمزہ شنواری

سید فارغ بخاری

سید وقار عظیم

شیخ ایاز

For more books visit www.4Urdu.com

صوفی غلام مصطفیٰ تبسم

ہاجرہ مسرور

اشفاق احمد ------- علاقائی معتمد

حلقہ مشرقی پاکستان سے-------

ابوالحسن

ابراہیم خان

دیوان محمد اظراف

ڈاکٹر عبدالحئی

سجاد حسین

سید ولی اللہ

URDU4U.COM
بیگم شمس النہار محمود

عبدالقادر

عسکر بن شیخ

غلام مصطفیٰ

متین الدین احمد علاقائی ------- معتمد

۳۱ جنوری آخری نشست ڈاکٹر مولوی عبدالحق نے صدارت کی۔

۴ بجے شام گلڈ کا منشور پڑھا گیا۔

جلسہ عام کنونشن ختم ہونے کے اعلان کے ساتھ سٹیج سیکرٹری نے گلڈ کے منتخب سیکرٹری جنرل کو چارج دیا۔

ڈاکٹر جاوید اقبال' ڈاکٹر سجاد حسین' پروفیسر ممتاز حسین اور پروفیسر ابو رشد نے ادبی مقالے پڑھے۔

سیکرٹری جنرل نے تقریر کی۔

مندوبین کی درخواست پر صدر مملکت نے بھی تقریر کی اور گلڈ کو دس ہزار روپیہ کا ذاتی

For more books visit www.4Urdu.com

عطیہ دیا۔

چھاپے کے حروف کنونشن کی روئیداد کے پیچھے وہ گرما گرمی' وہ گہما گہمی' وہ دھما کہ خیزی اور وہ دھماچوکڑی بیان کرنے سے قاصر ہیں جو اس کے ہر جلسے اور ہر کمیٹی کا طرہ امتیاز تھے۔ ہر بحث مباحثے میں گرمی گفتار کی شدت اور حدت کبھی کسی سیاسی تنازعات کا رنگ اختیار کر لیتی تھی' کبھی لسانی اور علاقائی اختلافات کی تلخیاں ابھر آتی تھیں۔ کبھی ذاتیات کی آن اور انا کا شدید ٹکراؤ ہوتا تھا۔ بسا اوقات تو یوں محسوس ہوتا تھا کہ اچانک سر پھٹول شروع ہو کر انجمن سازی کا یہ کھڑاگ درہم برہم ہو جائے گا' لیکن ہر قسم کے لڑائی جھگڑے' گالی گلوچ اور لعن طعن کے بعد جب کنونشن اپنے بنیادی مقصد میں کامیاب ہو کر اپنے آخری اجلاس کے لیے جمع ہوئی' تو مشرقی اور مغربی پاکستان کے کئی مندوبین کے گلے پک پک کر بیٹھ چکے تھے۔ سب سے زیادہ گلا جمیل الدین عالی کا بیٹھا ہوا تھا۔

جب انتخابات کا لمحہ آیا' تو مجھے معلوم ہوا کہ چند سینئر ادیبوں کا ارادہ ہے کہ مجھے گلڈ کے پہلے سیکرٹری جنرل کے طور پر بلا مقابلہ منتخب کیا جائے۔ مجھے یہ اعتراف ہے کہ انجمن سازی کے بکھیڑوں سے نپٹنے کے لیے میری صلاحیت کار نہایت محدود ہے۔ اس کے علاوہ مجھے احساس تھا کہ میری سرکاری پوزیشن کی وجہ سے گلڈ پر خواہ مخواہ بے بنیاد شکوک و شبہات کا غبار بدستور چھایا رہے گا۔ میں نے ان خدشات اور اپنی ذہنی ہچکچاہٹ کا ذکر کئی افراد سے کیا۔ لیکن کوئی اسے میرا عذر لنگ سمجھ کر ٹال دیتا تھا۔ کوئی اسے میری کسر نفسی پر محمول کر کے رد کر دیتا تھا۔ ایک محفل میں تو کوی جسیم الدین نے اپنی بنگالی نما اردو میں آخری فیصلہ اس طرح دے دیا۔ "ارے بھائی اب تم ہم سے بھاگنا چاہے گا بھی تو بھاگ سکے گا نہیں۔ گلڈ نیا بچہ ہے۔ اس کی سواری کے لیے ایک ٹھور گھوڑا درکار ہے۔ تم پریذیڈینٹ ہاؤس میں پلا ہوا اچھا سرکاری درباری گھوڑا ہے۔ تم ہمارے بہت سارے کم آ سکتا ہے۔ اب ہم تم کو بالکل نہیں چھوڑے گا۔" گھوڑے

For more books visit www.4Urdu.com

کا لفظ میں نے فقط اپنی عزت بڑھانے کی خاطر استعمال کیا ہے۔ کوی جسیم الدین نے دراصل کسی اور چوپائے کا نام لیا تھا۔

URDU4U.COM

سیکرٹری جنرل منتخب ہونے سے پہلے ہی میری یہ ڈیوٹی لگ گئی تھی کہ کنونشن کے آخری اجلاس میں صدر ایوب کو ضرور لاؤں۔ میں نے صدر کے ملٹری سیکرٹری بریگیڈیئر نوازش علی سے اس خواہش کا ذکر کیا' تو اس نے منہ بنا کر' ناک چڑھا کر اپنا سر نفسی میں زور زور سے ہلایا اور کہا۔ "صدر اس قدر مصروف ہیں کہ اس قسم کی ٹٹ پونجیا تقریبات میں جانے کا وقت ہرگز نہیں نکل سکتا۔"

اس زمانے کی نوکر شاہی کے تصور میں ادیب نام کی کوئی قابل قدر جنس عالم وجود میں موجود ہی نہ تھی۔ کچھ افسران بالا شاید چند شاعروں کے نام سے کسی قدر واقف تھے۔ جنہیں حسب ضرورت کسی مشاعر سے یا تقریب سے طلب کیا جا سکتا تھا۔ اس کے علاوہ ادیبوں کی کوئی کنونشن بھی ہو سکتی ہے اور وہاں پر سربراہ مملکت کو بھی مدعو کیا جا سکتا ہے۔ یہ کسی بیوروکریسی کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا۔ بریگیڈیئر نوازش علی سے مایوس ہو کر میں سیدھا صدر ایوب کے پاس گیا اور اپنی درخواست ان کی خدمت میں پیش کی۔

کسی قدر تامل کے بعد انہوں نے پوچھا۔ "کیا میرا وہاں جانا ضروری ہے؟"

"جی نہیں۔" میں نے جواب دیا۔ "ضروری تو بالکل نہیں۔ البتہ مناسب ہے۔"

کچھ مزید سوال جواب کے بعد صدر نے کنونشن میں جانا منظور کر لیا اور ٹیلی فون پر بریگیڈیئر نوازش علی کو حکم دیا کہ ان کی مصروفیات میں ۳۱ جنوری کو شام کے چار بجے سے ایک دو گھنٹے کا وقت رائٹرز کنونشن کے لیے مختصف کر دیا جائے۔

اس کے بعد برگیڈیئر نوازش علی سے جب میری مڈبھیڑ ہوئی' تو ان کا منہ سوج کر کپا ہو گیا تھا۔ صدر کے کنونشن میں جانے پر تو وہ برہم تھے ہی۔ اب انہیں مزید غصہ تھا تو یہ کہ ایسی ٹٹ پونجیا تقریب میں ہم لوگ گھنٹہ دو گھنٹہ بیٹھ کر کیا کریں گے؟

For more books visit www.4Urdu.com

میں نے ان کی ڈھارس بندھائی کہ جو مکھیاں ہم ماریں گے' وہی تم بھی مارتے رہنا' لیکن وہ بدستور بگڑا رہا اور پلٹ کر پوچھا۔ "سکیورٹی کا کیا بندوبست ہو گا؟"

URDU4U.COM

میں نے فی الفور بیوروکریٹ کا روایتی عمامہ سر پر رکھا' اور اپنے لہجے میں برف کی سی خنکی ڈھال کر جواب دیا۔ "یہ میرا دردسر نہیں۔ سیکورٹی والوں سے پوچھو۔" ساتھ ہی تابڑ توڑ ایک ہی سانس میں یہ بھی کہا۔ "اور ہاں بریگیڈیئر۔ صدر کے ساتھ دو سے زیادہ پرسنل سٹاف نہ ہو۔ ہمارے پاس نشستوں کی کمی ہے۔"

اس کے بعد غالباً ملٹری سیکرٹری کے ایما پر سکیورٹی والوں کی بھڑوں کا چھتہ کھل گیا اور ہر وقت سول اور فوجی حفاظتی اداروں کے بھونڈ میرے سر پر بھنبھنانے اور منڈلانے لگے۔ کوئی مارشل لاء والوں کی طرف سے آتا تھا۔ کوئی انٹیلی جنس بیورو کی جانب سے آتا تھا۔ اور کنونشن میں شامل ہونے والے مندوبین کے نام' ولدیت' جائے سکونت' اخلاقی معیار' سیاسی رجحان وغیرہ وغیرہ کے متعلق ایک ہی طرح کے درجنوں سوال پوچھتا تھا۔ اس صورتحال سے عہدہ برآ ہونے کے لیے میں نے اپنی آئی۔ سی۔ ایس کی ٹریننگ کو اپنی ڈھال بنایا' اور ایک پختہ کار بیوروکریٹ کی طرح کسی اشتعال طبع کے بغیر جچے تلے الفاظ میں انتہائی ٹھنڈک اور تحمل سے سب کو یہ کہہ کر نمٹاتا رہا کہ کنونشن میں مدعو ہر مندوب اور رضا کار کو خصوصی نشان امتیاز جاری کئے جائیں گے۔ جس کسی نے یہ بلا پہنا ہوا ہو' آپ کا فرض ہے کہ اس کے احترام اور عزت نفس کا پورا پورا خیال رکھیں۔ حفاظتی تقاضے پورے کرنا آپ کا کام ہے' لیکن اس کارروائی میں کسی غوغائی یا مزاحمانہ یا خلل اندازانہ رنگ کا ہرگز کوئی شائبہ نہ ہو۔

چند سر پھرے سکیورٹی افسر کچھ مزید بحثا بحثی کرنے کی کوشش شروع کرتے تھے تو میں پرانے انگریز افسروں کی طرح دو ٹوک انداز میں یہ کہہ کر اٹھ کھڑا ہوتا تھا۔

"Well officer, that,s all from me"

سکیورٹی والوں کی کشاکشی کسی قدر کم ہوئی' تو کنونشن کے آخری روز ایک اور افتاد آ پڑی۔ میں کے جی اے ہال میں صبح کے اجلاس میں بیٹھا تھا کہ پریذیڈنٹ ہاؤس سے

For more books visit www.4Urdu.com

ملٹری سیکرٹری کا ٹیلی فون آیا۔ اس نے مسرت اور بشاشت سے لبریز لہجے میں مجھے بتایا کہ صدر ایوب کو کل رات سے بخار آ رہا ہے۔ اس لیے آج تیسرے پہر وہ کنونشن کے اختتامی اجلاس میں شریک نہیں ہو سکتے۔ یہ کہہ کر انہوں نے ٹلی فون صدر کے ذاتی معالج بریگیڈیئر ایم۔ سرور کے حوالے کر دیا۔ جنہوں نے اس بات کی تصدیق کی کہ بخار کہ وجہ سے صدر کنونشن میں آنے سے معذور ہیں۔

مجھے صدر کے بخار کی خبر کی صداقت پر یقین تو آ گیا' لیکن مایوسی بھی بہت ہوئی۔ میں صدر کی مزاج پرسی کے بہانے دو بجے پریذیڈنٹ ہاؤس پہنچا۔ وہ ڈریسنگ گاؤن پہنے برآمدے میں ایک آرام کرسی پر دراز تھے اور کچھ فائلیں پڑھ رہے تھے۔ مجھے دیکھ کر وہ مسکرائے اور بولے۔ "میں یونہی بہانہ نہیں کر رہا۔ اس وقت بھی مجھے ۱۰۰ درجہ کا بخار ہے۔"

"نہیں سر' میں تو صرف آپ کی خیریت پوچھنے آیا ہوں۔" میں نے کہا۔

"تمہارے ادیب لوگ یہ تو نہیں سمجھیں گے کہ میں بہانہ کر رہا ہوں؟" انہوں نے پوچھا۔

"ادیب جو چاہیں سمجھتے رہیں۔ اگر ڈاکٹر نے آرام کا مشورہ دیا ہے' تو آپ کو ضرور آرام کرنا چاہیے۔"

"کچھ لوگ تو یہی سمجھیں گے کہ یہ ان پڑھ فوجی آدمی ہے۔ پڑھے لکھے لوگوں کا سامنا کرنے سے بھاگ گیا۔" صدر ایوب نے کسی قدر سنجیدگی اور کسی قدر مذاق سے پوچھا۔

"نہیں سر' میں نے کہا۔ "جب انہیں معلوم ہو گا کہ آپ کو ۱۰۰ درجہ کا بخار ہے۔ تو وہ خواہ مخواہ ایسا کیوں سمجھیں گے' اور اگر کچھ لوگ ایسا سمجھتے بھی ہیں تو کیا فرق پڑتا ہے۔ بخار آخر بخار ہے۔ وہ بھی ۱۰۰ درجہ کا۔"

اپنی طرف سے تو مین نے اپنے لہجے میں کوئی طنزیہ انداز سمونے کی کوشش نہیں کی تھی۔ لیکن میری بات سن کر صدر ایوب کچھ اور ہی طرح مسکرائے اور بولے۔ "خیر' یہ اتنی بڑی کوئی بیماری بھی نہیں ہے۔ نوازش اور سرور خواہ مخواہ فکر مند ہیں۔ میرا خیال ہے میں کنونشن میں آؤں گا۔ کوئی تقریر بھی کرنا پڑے گی؟"

For more books visit www.4Urdu.com

"جی نہیں سر' آپ کی طرف سے ہم نے کوئی تقریر نہیں رکھی۔ آپ اگر ہماری چند باتیں سن ہی لیں' تو ہمارے لیے یہ بہت بڑا اعزاز ہے۔"

URDU4U.COM

"Good" صدر ایوب نے کہا۔ "میں ضرور وقت پر آ جاؤں گا۔"

مجھے یقین تھا کہ جلسے کے اختتام پر سامعین ضرور صدر مملکت سے بھی کچھ سننا چاہیں گے' لیکن میں نے جان بوجھ کر پروگرام میں ان کی کوئی تقریر نہ رکھی تھی' کیونکہ اگر ایسا کیا جاتا تو صدر کے سیکرٹری کے طور پر میرا فرض منصبی بنتا تھا کہ ان کی تقریر کا ڈرافٹ تیار کر کے ان کی خدمت میں پیش کرتا۔ لیکن آج میں نے ایک سوچا سمجھا خطرہ مول لے کر چالاکی سے اپنے اس فرض سے دیدہ و دانستہ کوتاہی اختیار کر لی۔ کیونکہ کنونشن میں صدر مملکت کے منہ سے میں اپنے ڈرافٹ کئے ہوئے فقرے نہیں سننا چاہتا تھا' بلکہ دوسروں کی طرح مجھے بھی یہی ٹوہ لگی ہوئی تھی کہ دیکھیں ادب اور ادیبوں کے متعلق صدر ایوب کے اپنے ذاتی خیالات کیا ہیں؟"

کنونشن کے آخری اجلاس میں صدر ایوب ٹھیک وقت پر تشریف لے آئے' ہال میں داخل ہوتے ہی حاضرین نے کھڑے ہو کر تالیوں سے ان کا استقبال کیا۔ تین ماہ سے ایوب خان صاحب صدر مملکت اور چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر کے طور پر ملک بھر میں سیاہ و سفید کے مالک بنے ہوئے تھے۔ اس حیثیت میں وہ ہر محفل اور تقریب میں سب سے اعلیٰ مرکزی اور نمایاں نشست پر متمکن ہونا اپنا قدرتی حق سمجھنے لگے ہوں گے۔ غالباً اسی وجہ سے ہال میں داخل ہوتے ہی وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتے' ناک کی سیدھ سٹیج کی جانب لپکے۔ میرے لیے یہ بڑا کٹھن مرحلہ تھا' لیکن ہمت کر کے میں نے انہیں روکا اور چند دوسرے ساتھیوں کی مدد سے گھیر گھار کر انہیں سامعین کی اگلی صف میں لا بٹھایا۔ جہاں ان کے لیے ایک خالی کرسی محفوظ رکھی گئی تھی۔ صدر ایوب کے کان تو کسی قدر سرخ ضرور ہوئے' لیکن پیشانی پر کوئی بل نہ آیا۔ البتہ ان کا پرسنل فوجی سٹاف بری طرح سٹپٹایا ہوا دکھائی دے رہا تھا اور وہ ہم سب کو قہر آلود نگاہوں سے گھور رہے تھے۔

For more books visit www.4Urdu.com

لیکن میرے لیے اس سے بھی زیادہ کٹھن مرحلہ اس وقت آیا۔ جب بابائے اردو نے سٹیج پر آ کر کرسی صدارت سنبھالی۔ سٹیج سیکرٹری کی حیثیت سے جمیل الدین عالی ان کے ایک طرف بیٹھے اور منتخب شدہ سیکرٹری جنرل کے طور پر مجھے ان کے دوسری جانب بیٹھنا پڑا مملکت کے مطلق العنان صدر کو نیچے سامعین کی صف میں بٹھا کر اس کے سیکرٹری کا خود سٹیج پر چڑھ کر براجمان ہونا بظاہر بڑی غیر متوازن اور اہانت آمیز جسارت نظر آتی تھی۔ جو لوگ اس ساری صورت حال پر پہلے ہی سے چیں بجبیں تھے۔ ان کے لیے تو خاص طور پر یہ حرکت زخم پر نمک چھڑکنے کا اثر رکھتی تھی۔ سٹیج پر بیٹھنے کے بعد میں سارا عرصہ بڑی کوشش اور محنت سے صدر ایوب کے ساتھ آنکھیں ملانے سے گریز کرتا رہا۔ ان سے آنکھیں چار کئے بغیر میں وقتہ فوقتہ کن انکھیوں سے انہیں چوری چوری جھانک لیتا تھا' تاکہ ان کے چہرے کے اتار چڑھاؤ سے ان کے ذہنی ردعمل کا جائزہ لگتا رہے۔ جب اجلاس کی کاروائی شروع ہوئی' تو میں نے محسوس کیا کہ صدر ایوب کا چہرہ یکایک سرخ سا ہو رہا ہے۔ میرے دل میں کئی طرح کے وسوسوں نے سر اٹھایا۔ شاید صدر صاحب کا بخار اچانک تیز ہو گیا ہو۔ یا شاید اپنے آپ کو نیچے سامعین کی صف میں اور اپنے سیکرٹری کو سامنے سٹیج کے اوپر بیٹھا ہوا دیکھ کر ان کے مزاج کا پارہ چڑھ رہا ہو۔ لیکن بعد میں معلوم ہوا کہ کے جی اے ہال کے ایک ٹوٹے ہوئے روشندان سے سورج کی کرنیں براہ راست جناب صدر کے منہ پر پڑ کر انہیں تنگ کر رہی ہیں۔ ہمارے پاس اس کا کوئی علاج نہ تھا۔ ایوب خان صاحب نے خود ہی کنونشن کے چھپے ہوئے پروگرام کا کتابچہ کھول کر پھیلایا اور دھوپ سے بچنے کے لیے اسے اپنی آڑ بنا لیا۔ اس کے بعد وہ ہمہ تن کنونشن کی کارروائی سننے میں منہمک ہو گئے۔

بابائے اردو ڈاکٹر مولوی عبدالحق کا خطبہ صدارت انہوں نے نہایت غور سے سنا' اور کئی جگہ دوسروں کے ساتھ مل کر انہوں نے تالیاں بجانے میں بھی حصہ لیا۔ چند مقامات پر جہاں بابائے اردو کو بڑی گرم جوشی سے داد ملی' یہ تھے:

"میں اس نادر اجتماع پر نظر ڈالتا ہوں تو اس میں ایسے ایسے فاضل ادیب دیکھتا ہوں جو

For more books visit www.4Urdu.com

جدید عہد کے تقاضوں' ادبی نکات و رموز اور ادیبوں کے حقوق و فرائض پر زیادہ بصیرت' گہرائی اور دقت نظر سے بحث کرتے ہیں۔ یہ نوجوان ادیب زیادہ مستعد اور باخبر ہیں۔ میں بہت پیچھے رہ گیا ہوں۔ یہ بہت آگے بڑھ گئے ہیں۔ بنظر انصاف دیکھا جائے تو ان کے ہوتے ہوئے میں اس منصب کا مستحق نہیں جو آپ نے مجھے عطا فرمایا ہے۔ غور کرتا ہوں تو اس کی ایک ہی وجہ معلوم ہوتی ہے۔ بڑے بوڑھوں کا ادب ہماری قدیم تہذیب میں داخل ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آپ کے زمرے میں کچھ دقیانوسی خیالات کے حضرات شریک ہیں جو اپنی آبائی سنت پر قائم ہیں۔ انہوں نے اہلیت سے زیادہ سفید بالوں کا لحاظ کیا ہے.....

"ہمارے ادب میں جو جمود پایا جاتا ہے' وہ بہت غور طلب ہے..... اب ہمیں ذہنی اور ادبی جمود کو توڑنے کے لیے وہی کرنا ہو گا جو اٹھارویں صدی میں فرانس میں انسائیکلوپیڈسٹ Encyclopaedists نے کیا تھا۔ اس عالی ہمت' جرت مند مفکروں کی مختصر جماعت نے علم و حکمت کی شمع روشن کی اور اوہام باطلہ اور خیالات فاسدہ کی قلع قمع کرنا شروع کیا کائنات اور انسان' ریاست اور معاشرہ' مذہب اور اخلاق کے قدیم نظریات اور روایات کو بڑی جرات اور آزادی سے عقل و حکمت کی کسوٹی پر کسا' اور جملہ علوم انسانی کو نئی بنیادوں پر قائم کرنے کی کوشش کی۔ اس انسائیکلوپیڈیا نے خیالات میں تغیر عظیم پیدا کر دیا اور ملک میں بیداری کی ایک نئی لہر دوڑا دی' مگر حکومت اور کلیسا دو بڑی قوتیں درپے آزاد ہو گئیں۔ طرح طرح کی سختیاں کی گئیں۔ تکلیفیں پہنچائی گئیں۔ حکومت کی طرف سے کتاب کے چھپنے کی ممانعت کر دی گئی۔ مطبع میں چھپتے وقت مضامین میں تحریف کر کے کتاب مسخ کر دی گئی۔ لیکن باوجود ان تمام موانعات اور مصائب کے ان علم و ادب کے شیدائیوں نے کام جاری رکھا اور ان ہی معتوب اور ستم رسیدہ ادیبوں کے افکار و خیالات نے اس عظیم انقلاب کی راہ ہموار کی جو "انقلاب فرانس" کے نام سے مشہور ہے.....

"ہماری قوم میں بھی ہماری ہی زندگی میں ایک ایسا ذہنی انقلاب واقع ہو چکا ہے۔ یہ انقلاب

For more books visit www.4Urdu.com

سر سید احمد خان کی پرخلوص سرفروشانہ مساعی سے عمل میں آیا۔ میں اپنے آپ کو بہت خوش نصیب سمجھتا ہوں کہ مجھے قوم کے اس مصلح اعظم کو قریب سے دیکھنے اور ان کے ساتھ کام کرنے کی سعادت حاصل ہو رہی ہے۔ سر سید نے جس وقت اس منزل میں قدم رکھا تو مخالفت کا طوفان برپا ہو گیا۔ لعن طعن سب وشتم کی بوچھاڑ ہونے لگی۔ کفر کے فتوے صادر ہوئے اور ملحد' دجال' کرسٹان کے خطاب عطا ہوئے۔ اس نے سب کچھ سہا اور اپنے عزم پر قائم رہا....."

"ایسے لوگ بنی نوع انسان کے محسن ہیں اور زندہ جاوید ہیں۔ ہمیں ان سے سبق حاصل کرنا چاہیے۔ صرف انجمن بنا دینا' قرار دادیں منظور کرنا یا حکومت سے امداد حاصل کرنا کافی نہ ہو گا۔ ہمیں کام کرنا ہو گا۔ کام سے مراد یہ نہیں جو سرکاری دفتروں میں ہوتا ہے کہ ۹ بجے آئے اور ۴ بجے چلتے بنے' یہ کام جو ہمیں کرنا ہے پوری قوت سے کرنا ہو گا۔ دن رات' گرمی سردی' بارش سے بے نیاز ہو کر کام سے عشق ہونا چاہیے۔ عشق نہیں تو وہ کام نہیں بے گار ہے....."

"سلطنتوں کے تخت الٹ جاتے ہیں۔ قومیں فنا ہو جاتی ہیں۔ تہذیبیں مٹ جاتی ہیں' لیکن ان کے ادیبوں کے کارنامے زندہ رہتے ہیں..... ادیب قوموں کی اصل پونجی ہیں۔ اس پونجی کی حفاظت اور نگہداشت قوم کا مقدس فرض ہے...."

"ادب ایک شریف پیشہ ہے۔ اس کی شرافت پر آنچ نہ آنے دیجئے۔ راستی اور خلوص آپ کا شعار ہونا چاہیے۔ آپ ادب کے ذریعہ قوم کے اخلاق اور کردار بنانے' روشن خیالی پھیلانے اور باطل خیالات اور اوہام کی تاریکی مٹانے میں بہت بڑی خدمت انجام دے سکتے ہیں۔ اپنے پیچھے ایسی یادگار چھوڑ جایئے کہ آئندہ نسلیں اس سے فیض حاصل کرتی رہیں۔"

For more books visit www.4Urdu.com

بارے دنیا میں رہو غمزدہ یا شاد رہو
ایسا کچھ کر کے چلو یاں کہ بہت یاد رہو

URDU4U.COM

ڈاکٹر مولوی عبدالحق کی تقریر کے بعد چار مقالے پڑھے گئے۔ خاص طور پر ڈاکٹر جاوید اقبال کے انگریزی مقالہ جو "ادیب' قوم پرستی اور لادنیت" کے موضوع پر تھا۔ صدر ایوب خان نے نہایت غور اور توجہ سے سنا' مقالوں کے بعد گلڈ کے منتخب شدہ سیکرٹری جنرل کے طور پر میری کچھ کہنے کی باری تھی۔ میں نے بھی انگریزی میں "ادیب اور آزادی تحریر" پر ایک مضمون پڑھا۔ پہلے تو صدر ایوب اپنے سیکرٹری کو گھر کی مرغی دال برابر سمجھ کر کسی قدر بے توجہی سے ساکن و جامد بیٹھے رہے' لیکن کئی فقروں پر جب کئی بار سارا ہال تالیوں سے گونج اٹھا' تو غالباً وہ بھی متوجہ ہوئے اور پھر کسی مقام پر مسکراتے اور کسی جگہ اثبات میں سر ہلاتے رہے۔ میرے مضمون کے کچھ حصوں کا ترجمہ درج ذیل ہے:

"اس سے پہلے کہ ادیب اور اس کی آزادی تحریر پر گفتگو کی جائے۔ یہ بہتر ہے کہ اس کی ذمہ داریوں کی وضاحت کر دی جائے----- وہ ذمہ داریاں یہ ہیں:

۱۔ ادیب کسی حیثیت سے بھی قانون سے بالا نہیں ہوتا۔

۲۔ وہ ایک ملک میں رہتے ہوئے کسی دوسرے ملک کا وفادار نہیں ہو سکتا۔

۳۔ کسی ایک نظریہ کی تبلیغ کرتے ہوئے Poetic License شاعری کی آڑ لے کر کسی دوسرے نظریہ پر عمل پیرا نہیں ہو سکتا۔

"یہ حدیں تمام اچھے شہریوں پر عائد ہوتی ہیں' لیکن ان کا اطلاق زیادہ شدت سے ادیب پر ہوتا ہے۔ کیونکہ وہ ہر لمحے عوام کی نظروں میں رہتا ہے۔ جو کچھ وہ لکھتا ہے۔ ضروری نہیں کہ یاد کے خزانے میں گم ہو جائے۔ اس کے برعکس یہ بھی ممکن ہے کہ اس کی آواز کی گونج صدیوں تک سنائی دیتی رہے۔ ادیب جتنا زیادہ مقبول ہو گا' اتنا ہی اس پر ذمہ داریوں کا بوجھ زیادہ ہو گا..... اثر انداز ہونے کی اہلیت ادیب کے

For more books visit www.4Urdu.com

لیے نعمت بھی ہے اور مصیبت بھی۔ مصیبت یہ ہے کہ ادیب جیسے غیر معمولی فرد کو عام ترازو میں تولا جاتا ہے۔ اگر آپ کو ادیب میں کوئی کمی یا کجی محسوس ہو تو لازمی طور پر یہ نہ ادیب کا قصور ہے نہ ترازو کا۔ بلکہ ممکن ہے یہ آپ کے جائزے یا آپ کی نظر کا قصور ہو۔"

"ادیب آپ سے برداشت کی نہیں فہم کی بھیک مانگتا ہے۔ مجسٹریٹ یا پولیس انسپکٹر کا فہم نہیں۔ بلکہ ایک باشعور پڑھنے والے کا فہم۔ ایک اعلیٰ اقدار میں یقین کرنے والے کا فہم۔ ایک سچائی کے پرستار کا فہم۔ آپ چور کو پکڑنے کے لیے کسی دوسرے چور کی خدمات حاصل کر سکتے ہیں۔ لیکن ادیب کو سمجھنے کے لیے آپ کو پڑھنے والے کی تلاش کرنا ہو گی۔ سرکاری افسر جو ادیب اور اس کے حقوق کا فیصلہ کرتے ہیں۔ اگر ان کا مطالعہ صرف دفتری مثلوں اور یادداشتوں تک محدود ہے اور ان کی زندگی کے کوئی لمحات کتابوں کی قسمت میں نہیں' تو وہ ہمیشہ ادب کو غلط سمجھیں گے اور اسے حقارت سے دیکھیں گے۔ یہ سرکاری افسر کبھی اس حقیقت تک نہیں پہنچ سکتے کہ جسمانی سزائیں ضروری نہیں کہ روح کے لیے بھی عذاب ہوں اور یہ کہ دنیا کے تمام قانون اور سائنس کی تمام ترقی وہ زنجیر ایجاد کرنے سے قاصر ہے جو علم اور سچائی کو جکڑ سکے۔"

"ادیب کی آزادی کے لیے دوسرا خطرہ اس حقیقت سے پیدا ہوتا ہے کہ وہ فاصلے اور وقت کی حدوں سے ماورا ہو کر زندہ رہ سکتا ہے۔ وہ ان جانی اور ان دیکھی حقیقتوں کو چھوتا ہے اور اس کے مستقبل کے خواب ممکن ہے آج کی زندگی کی مصلحتوں اور تقاضوں کے بالکل برعکس ہوں۔ وہ نہ پاگل ہے نہ غدار------ بات صرف اتنی ہے کہ اس کی نظر زیادہ گہری اور اس کے جذبات آپ سے زیادہ شدید ہیں۔ اگر آپ ان بلندیوں کا احساس اپنے ذہن میں نہیں رکھتے تو آپ ادیب کے ساتھ کبھی انصاف نہ کر سکیں گے۔"

"ادیب کی آزادی کو تیسرا خطرہ اس کی اقتصادی پست حالی ہے۔ ہمارے ملک میں کتابیں

For more books visit www.4Urdu.com

اس لیے نہیں بکتیں کہ وہ سستی نہیں اور تعلیم عام نہیں جو خرید سکتے ہیں وہ پڑھتے نہیں۔ جو پڑھنا چاہتے ہیں وہ خرید نہیں سکتے۔ اس تمام تضاد میں صرف ایک شخص فائدہ اٹھاتا جاتا ہے' اور وہ ہے ناشر....."

URDU4U.COM

"ادیب کی آزادی کے لیے ایک اور بھی خطرہ ہے۔ وہ خطرہ بیرونی ہے ہمارا ملک ایک چھوٹا سا ملک ہے۔ ہم غریب ہیں۔ ہم نے اپنے معاملات کو الجھا دیا ہے۔ ان الجھنوں کی وجہ سے ہمارے کئی ہمدرد پیدا ہو گئے ہیں۔ مدد دینے والے ہمدرد۔ مذاق اڑانے والے ہمدرد۔ ہمدردی کے پردے میں دشمنی کرنے والے ہمدرد....."

"کوئی ہمارا ذہنی مکہ واشنگٹن بنانے کے درپے ہے۔ کوئی ماسکو اور کوئی کلکتہ۔ ماسکو اور کلکتہ والے ہمارے نظریات کی بیخ کنی (Subvert) کرنا چاہتے ہیں۔ واشنگٹن والے ہمیں اپنی راہ لگانا (Convert) چاہتے ہیں۔ لیکن یاد رکھئے ہمارا ذہنی مکہ صرف پاکستان میں ہے اور کہیں نہیں----- پاکستان کے ادیب عالمی سیاست کی بساط پر مہرے نہیں بننا چاہتے۔ ہم غریب سہی۔ لیکن ہمارا اپنا کوئی ذہنی اور ثقافتی افق ہے۔ کچھ دیر ہمیں اپنے چمن کی بھی سیر کرنے دیجئے....."

"آج جب کہ مارشل لاء کے ۶۹ ضابطے میرا احاطہ کئے ہوئے ہیں اور چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر بنفس نفیس میرے سامنے بیٹھے ہیں۔۔ میں نہایت آزادی سے وہ سب کچھ کہہ سکا ہوں جو ابھی کہہ چکا ہوں۔ میرا خیال ہے کہ ادیب کے طور پر اگر میری اتنی آزادی برقرار رہے' تو یہ میرے لیے قابل قبول ہے۔"

ہرچہ بادا باد کشتی من ور آپ اندر ختم کے مصداق میں نے بھی آج موقع پا کر آزادی تحریر پر اپنے دل کا کچھ غبار نکال باہر پھینکا۔ تقریر ختم کر کے جب میں واپس اپنی کرسی پر بیٹھا' تو بابائے اردو نے مجھے دو تین بار شاباش شاباش کہا۔ پھر مسکرا کر بولے۔

"اب تمہارا کیا بنے گا؟ ایک تو تم صدر کو نیچے بٹھا کر خود سٹیج پر چڑھے بیٹھے ہو۔ دوسرے ایسی تیز تقریر بھی کر ڈالی۔" پھر کچھ سوچ کر وہ خود ہی بولے۔ "خیر کوئی بات نہیں۔

For more books visit www.4Urdu.com

نکال دیئے گئے تو انجمن میں چلے آنا۔"

"آخر میں بابائے اردو نے صدر ایوب کو مخاطب کر کے کہا۔ "محترم صدر پاکستان۔ حاضرین جلسہ آپ سے بھی کچھ ارشادات سننے کے آرزو مند ہیں۔ اگر آپ اس جلسہ سے خطاب فرمانا منظور فرمائیں' تو ہماری عزت افزائی ہو گی۔"

یہ سن کر صدر ایوب نے پہلے تو مجھے گھور کر دیکھا' لیکن پھر یہ دعوت قبول کر کے اٹھ کر سٹیج پر آ گئے اور انہوں نے نہایت خود اعتمادی سے انگریزی میں فی البدیہہ تقریر کی جس کے کچھ حصوں کا اردو ترجمہ درج ذیل ہے:

"مجھ سے کہہ دیا گیا تھا کہ مجھ سے کسی تقریر کے لیے نہیں کہا جائے گا اور اسی لیے میں نے اپنی کرسی آرام سے سنبھال لی۔ اب مجھے مدعو کیا گیا ہے کہ میں کچھ کہوں۔ میں تقریر پر تیار نہیں ہوں اور ایسے ایسے اہل علم و فضل سامنے ہیں۔ مجھے اعتراف کر لینا چاہیے کہ میں آپ کی کاروائیوں سے بہت متاثر ہوا ہوں..... مجھے یہ دیکھ کر انتہائی مسرت ہوئی کہ آپ کے مقررین میں تخلیقی اور مجاہدانہ خصوصیات نمایاں تھیں۔ مجھے یقین ہے کہ یہ خصوصیات پاکستان کے استحکام اور عظمت کے لیے بہت کام آئیں گی....."

"ایک فوجی کی سادہ زبان میں پاکستان کا نصب العین بہت واضح ہے۔ انسانوں کے لیے بہتر سے بہتر آرام دہ بھرپور اور مکمل زندگی۔ ایک مضبوط اور ترقی پسند معاشرہ..... اس کے لیے ہمیں گہری بنیادوں پر منصوبی بندی اور مخلصانہ اور مسلسل کام کی ضرورت ہے..... کام کا مطلب یہ نہیں کہ صرف عمال حکومت یا فیکٹریوں کے مزدور کام کریں۔ ہم سے ہر ایک کو کام کرنا پڑے گا۔ ہر کام کرنے والا پاکستان کی مشین میں ایک اہم پرزے کی حیثیت رکھتا ہے....."

کام کے سلسلے میں ہمیں اعتماد ہونا چاہیے کہ ہم درست کام کر رہے ہیں۔ اس سلسلے میں ادیب اور دانشور بہت اہم کردار ادا کر سکتے ہیں۔ وہ بڑھتی ہوئی مادیت کی طرف سے لوگوں کی توجہ ہٹا سکتے ہیں۔ گو اس دنیا میں ہم مادیت کی طرف سے آنکھیں بند

For more books visit www.4Urdu.com

نہیں کر سکتے' مگر اس کی قوت کو اسلامی نظریات کے تابع کر سکتے ہیں....."

"پہلے انسانی جسموں کے لیے جنگیں ہوتی تھیں۔ آج ذہن انسانی کی تسخیر کے معرکے بپا ہیں۔ اس سلسلے میں آپ پر بہت سے فرائض عائد ہوتے ہیں آپ ذہن جدید کی زبان میں صالح نصب العین کی ترجمانی کر سکتے ہیں۔"

URDU4U.COM

"کسی نے یہ مسئلہ اٹھایا ہے کہ سنسر کے قانون کا وجود تخلیقی قوتوں کو دبا دیتا ہے۔ ہاں یہ خوشگوار بات ہے۔ لیکن اگر کوئی حکومت واقعی حکومت کہلانے کی اہل ہے' تو اسے آٹھ کروڑ انسانوں کے تحفظ کی ذمہ داری پوری کرنی پڑیگی۔"

"اگر کوئی شخص اپنے وطن میں غیر ملکی مفادات اور غیر ملکی نصب العین کی پرورش کرتا ہے' تو وہ یقیناً اپنے ملک کے لیے ناقابل برداشت ہے یہ ایک افسوسناک صورت حال ہو گی جس کا مقابلہ بے جھجکے اور مضبوط دل سے کرنا ہو گا۔ خواہ کوئی ادیب اتنا بڑا ہو کہ وہ مریخ سے باتیں کرے' اگر اس نے مادر وطن کی سلامتی کے خلاف کام کیا تو میں اپنے فرض میں کوتاہی کروں گا اگر اس سے باز پرس نہ کروں....."

"میری کوشش یہ رہی ہے کہ لوگوں کو اپنے لیے کام کرنے کے مواقع فراہم کرنے میں ان کی مدد کی جائے۔ آپ خود دیکھیں گے کہ آپ کو اپنے لائحہ عمل پر چلنے سے کوئی نہیں روکے گا۔ ہر شخص کو سوچنے اور عمل کرنے کی پوری آزادی ہونی چاہیے اور ہم آپ کے لیے جو کچھ ممکن ہے کریں گے....."

"آج کے نئے انتظامی ڈھانچے کی زبان بدقسمتی سے مارشل لاء کی زبان ہے۔ لیکن ہم نے اسے نرم سے نرم تر رکھنے کی کوشش کی ہے۔ ممکن ہے آپ اسے پسند نہ کرتے ہوں۔ لیکن اگر آپ نیتوں اور طریق کار پر غور کرتے رہیں تو دیکھیں گے کہ ہم بہت جلد اسے ایک عمدہ لائحہ عمل سے بدل دیں گے' جس سے انصرام ریاست کے ضوابط مرتب ہو جائیں گے....."

"میں نے آپ کا بہت وقت لیا' مگر میں آج بہت متاثر ہوا ہوں۔ آپ نے جو انجمن

For more books visit www.4Urdu.com

بنائی ہے' اس کے لیے آپ کو بہت سی مشکلات درپیش ہوں گی۔ میں اپنے طور پر کہیں نہ کہیں سے دس ہزر کا انتظام کر لوں گا جو میں اپنی پہلی پیش کش کے طور پر دیتا ہوں' مگر ازراہ کرم یقین کیجئے کہ میں جواب میں آپ سے کچھ نہیں چاہتا' آپ اسے ملکی مفاد کے لیے جس طرح چاہیں خرچ کریں۔"

URDU4U.COM

اگلے روز جب میں یوان صدارت میں اپنے دفتر پہنچا' تو فضا خوشگوار تھی۔ ہاتھی کے پاؤں میں سب کا پاؤں۔ صدر ایوب کنونشن کے اجلاس سے ہشاش بشاش لوٹے' تو ملٹری سیکرٹری اور دیگر عملے کا موڈ بھی خود بخود سازگار ہو گیا' لیکن رفتہ رفتہ مجھے یوں محسوس ہونے لگا کہ گلڈ کا سیکرٹری جنرل منتخب ہو کر میں پیچ در پیچ الجھنوں اور غلط فہمیوں کے گرداب میں پھنس گیا ہوں۔

ایک الجھن تو یہ تھی کہ چند ادیبوں کا ایک گروہ جو گلڈ کا رکن بھی تھا اور مختلف اوقات اور مقامات پر گلڈ کی تقریبات میں خوش دلی سے شامل بھی ہوتا تھا' لیکن کسی معقول دلیل یا ثبوت کے بغیر یہ حضرات اسی شک و شبہ پر جمے بیٹھے تھے کہ ہو نہ ہو یہ تنظیم کسی خفیہ مقصد کے لیے حکومت کے ایماء پر معرض وجود میں لائی گئی ہے۔ مزمن مرض کی طرح مزمن شک بھی آسانی سے رفع نہیں ہوتا۔ اس کا واحد علاج گلڈ کی ۲۳ سالہ تاریخ ہے جو سب کے سامنے ایک کھلی کتاب کی طرح حاضر ہے۔

دوسری الجھن یہ تھی کہ گلڈ قائم ہوتے ہی نوکر شاہی کا ایک مضبوط اور مخصوص عنصر بھی اس کے خلاف تلوار سونت کر اٹھ کھڑا ہوا۔ مغربی پاکستان کے گورنر نواب کالا باغ سے لے کر کے مرکزی وزیر' سیکرٹری اور مختلف درجوں کے محکمانہ افسر گلڈ کے نام سے بدکتے تھے اور اپنی بساط کے مطابق اس پر کسی نہ کسی طرح کی کاری ضرب لگانے سے نہ چوکتے تھے۔ مختلف لوگوں کے حوالے سے اس کی مختلف وجوہات تھیں۔ بیوروکریسی کا ایک طبقہ اس غلط فہمی میں مبتلا تھا کہ ہم نے صدر ایوب کو کامیابی سے بیوقوف بنایا ہے اور اس کی سرپرستی حاصل کر کے بائیں بازو کے غیر محب وطن دانشوروں کی پشت

For more books visit www.4Urdu.com

پناہی کے لیے ایک خطرناک تنظیم قائم کر رکھی ہے۔ چند بار مجھے کابینہ میں پیش ہو کر گلڈ کی صفائی میں طرح طرح کے احمقانہ سوالات کا جواب بھی دینا پڑا۔ بعض اوقات تو یوں محسوس ہوتا تھا کہ صدر ایوب کے علاوہ ساری حکومت میں اور کوئی گلڈ کا ہمدرد اور بہی خواہ موجود نہ تھا۔

اس کے علاوہ بیوروکریسی کی طبع نازک پر غالباً یہ بات بھی گراں گزرتی تھی کہ یہ دو دو ٹکے کے ادیب کل تک تو کسمپرسی کی حالت میں جوتیاں چٹخاتے پھرا کرتے تھے' لیکن اب اعلیٰ سے اعلیٰ سرکاری تقریبوں میں بھی مدعو ہو کر منہ اٹھائے چلے آتے ہیں۔ نہ لباس مناسب' نہ حلیہ درست' نہ آداب مجلس سے آشنا۔ لیکن جہاں دیکھو' وہاں کباب میں ہڈی کی طرح موجود۔ ایک بار میں نے حکومت کے سامنے یہ تجویز پیش کی تھی کہ بیوروکریسی کے اونچے طبقہ کو تنخواہ کا کچھ حصہ کتابوں کی صورت میں دینا چاہیے' تاکہ ان کا ذہنی افق کسی قدر کشادہ رہے۔ جملہ افسران کرام نے اسے اپنی توہین سمجھ کر پائے حقارت سے ٹھکرا دیا تھا۔ ایک بار کراچی کے ایوان صدر میں تقسیم اعزازات و خطابات کی تقریب منعقد ہوئی۔ حسب معمول وزیروں' امیروں اعلیٰ افسروں اور بیرونی سفیروں کی تعداد سینکڑوں میں موجود تھی۔ صدر کے سیکرٹری کے طور پر اعزاز پانے والوں کی فہرست میرے سپرد تھی۔ میں باری باری سے ہر اعزاز پانے والے کا نام پکارتا تھا۔ ہر شخص اپنی مخصوص نشست سے اٹھ کر آتا تھا۔ اپنا تمغہ یا سند وصول کرتا تھا۔ اور صدر کے ساتھ ہاتھ ملا کر اپنی سیٹ پر واپس چلا جاتا تھا۔ جب سرکاری اعزاز یافتگان کی لسٹ ختم ہو گئی' تو میں نے صدر ایوب کو مخاطب کر کے یہ اعلان کیا:

"مسٹر پریذیڈنٹ' سر۔ سرکاری اعزازات کی فہرست مکمل ہو گئی۔

اب میں آپ سے درخواست کرتا ہوں کہ براہ مہربانی پاکستان رائٹرز گلڈ کے ادبی پرائز جیتنے والے ادیبوں میں انعامات تقسیم فرمائیں۔"

صدر ایوب نے مسکرا کر اثبات میں سر ہلایا تو میں نے داؤد اور آدم جی انعامات حاصل

For more books visit www.4Urdu.com

کرنے والے ادیبوں کے نام باری باری پکارے۔ جنہیں ہم نے پہلے ہی سے ایوان صدر میں بلا کر خاص نشستوں پر بٹھا رکھا تھا۔ یہ کارروائی میں نے صدر ایواب کی منظوری سے کی تھی۔ بیرونی سفیروں سمیت حاضرین کے ایک طبقہ نے اس غیر رسمی اعلان کو تازہ ہوا کے جھونکے کی طرح محسوس کیا اور زور زور سے تالیاں بجا کر اس کا جوش و خروش سے خیر مقدم کیا گیا' لیکن نوکرشاہی کے پٹے ہوئے مہرے جو اپنی انا کی سلوں کے نیچے دب کر اور آداب و رسوم اور قواعد و ضوابط کے سرخ فیتے میں بے دست و پا ہو کر لکیر کے فقیر بن چکے تھے۔ اس اعلان کو سنکر دم بخود رہ گئے۔ ان کے نزدیک تقسیم اعزازات کا تقدس پامال ہو گیا تھا اور ادیبوں کی ایک مشتبہ تنظیم پر سرکاری پروٹوکول کی عزت و حرمت بلاوجہ قربان کر دی گئی تھی۔ اس وقت تو وہ خون کا گھونٹ پی کر بھیگی بلی بنے بیٹھے رہے' لیکن ایک سال کے اندر اندر انہوں نے کچھ ایسی ریشہ دوانیاں کیں کہ آئندہ کے لیے ایسی ہر تقریب میں اعزازات کی فہرست پڑھ کر نام پکارنے کا استحقاق صدر کے سیکرٹری سے چھین کر کیبنٹ سیکرٹری کے سپرد کر دیا۔ اس وقت سے آج تک یہی سسٹم رائج ہے۔

اگلی بار ہماری درخواست پر پھر صدر ایوب نے گلڈ کے ادبی انعامات اپنے ہاتھ سے تقسیم کرنا قبول کر لیا۔ اس بار ہم نے اس مقصد کے لیے راولپنڈی کے ایوان صدر میں ایک سادہ سی تقریب منعقد کی۔ انعام جیتنے والوں مین "ہفت کشور" کے مصنف جعفر طاہر بھی شامل تھے۔ وہ پاکستان کی فوج میں بے کمیشن کے افسر تھے۔ جب وہ انعام لینے آئے تو فوجی وردی میں ملبوس تھے۔ فیلڈ مارشل ایوب خان نے بڑی خندہ پیشانی سے ان کی پذیرائی کی' اور ان کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر جعفر طاہر سے ان کا حال احوال پوچھتے رہے۔ میں بھی نذدیک ہی کھڑا تھا۔ فیلڈ مارشل نے فخریہ انداز سے اپنی مونچھوں پر ہاتھ پھیرا اور مجھے مخاطب کر کے بولے۔ "تم نے دیکھا' فوج میں بھی کتنے پڑھے لکھے آدمی ہوتے ہیں۔"

جعفر طاہر نے ادبی زبان سے کہا: "جی ہاں' حضور۔ نان کمشنڈ رینک تک ہی رہتے ہیں!"

For more books visit www.4Urdu.com

اسی طرح کی ایک تقریب "اداس نسلوں" پر عبداللہ حسین کو بھی انعام دیا گیا تھا۔ چند روز بعد مجھے مغربی پاکستان کے گورنر نواب کالا باغ کا ٹیلی فون آیا۔ وہ اپنے مخصوص انداز میں بولے۔ "بھائی شہاب' یہ ہمارے محترم صدر صاحب کس کنجر خانے میں پڑ گئے ہیں؟"

میری درخواست پر انہوں نے وضاحت فرمائی۔ "میرا ہوم ڈیپارٹمنٹ اور پولیس کا محکمہ بڑا سیخ پا ہو رہا ہے کہ ہمیں پوچھے بغیر جناب صدر مملکت کس چکر میں پڑ گئے ہیں؟"

میری مزید درخواست پر انہوں نے مزید وضاحت کی۔ "وہ جو "اداس نسلیں" نام کی لچر بکواس ہے' اسے فحاشی کے الزام پر ضبط کر کے مقدمہ دائر کرنے کی مکمل تیاری تھی۔ اب جناب صدر نے اپنے دست مبارک سے اسے انعام دے مارا ہے۔ اب ہم کریں تو کیا کریں؟ بھائی شہاب' ہم لوگ بھی یہاں صدر صاحب کے خیر خواہ ہی بیٹھے ہیں۔ ایسے نازک معاملوں میں کبھی ہم سے بھی پوچھ لیا کریں۔"

نواب کالا باغ اور بیوروکریسی کے کل پرزوں نے صدر ایوب خان کو بار بار یہ تاثر دینے کی کوشش کی کہ حکومت کی سر پرستی کا فائدہ اٹھا کر گلڈ کے زیر سایہ بہت سی خطرناک اور ناپسندیدہ شخصیات کی پرورش ہو رہی ہے۔ ان میں فیض احمد فیض' احمد ندیم قاسمی' شہید اللہ قیصر' شوکت صدیقی' عبداللہ حسین وغیرہ کے نام سر فہرست تھے' اس کے برعکس صدر کے قریب میں ہی ایک ایسا تن تنہا فرد تھا' جو انہیں یہ باور کرانے کی کوشش میں لگا رہتا تھا کہ گلڈ کے ۱۲۰۰ ممبروں میں ابوالاثر حفیظ جالندھری' نسیم حجازی' الطاف حسین قریشی اور منشی عبدالرحمٰن جیسے فعال اراکین بھی شامل ہیں۔ لطیفہ کے طور پر میں نے انہیں بتایا کہ ہمارے کچھ ممبر ایسے ہیں کہ جس اجلاس میں خواتین موجود ہوں وہ اس میں شامل نہیں ہوتے' بلکہ کرسیاں نکال کر باہر برآمدے میں بیٹھے رہتے ہیں۔ اس کے برعکس کچھ ممبر ایسے بھی ہیں کہ اگر خواتین موجود نہ ہوں تو وہ اجلاس کے قریب تک نہیں آتے۔

For more books visit www.4Urdu.com

"تم خود کس گروپ میں شامل ہو؟" صدر ایوب نے ہنس کر پوچھا۔

"اس کا دارومدار خواتین پر ہے۔" میں نے بھی مذاقاً کہا۔ سج دھج ٹھیک ہو تو اجلاس میں شامل ہوتا ہوں۔ ورنہ شرفا کے پاس برآمدے میں آ بیٹھتا ہوں۔"

URDU4U.COM

جب تک میں صدر ایواب کے قرب و جوار میں موجود رہا' اس قسم کے اللے تللوں سے گلد کے متعلق متوازن تاثرات قائم رکھنے کے لیے حسب توفیق کوشش کرتا رہا' لیکن جب مجھے ملک سے باہر بھیج دیا گیا' تو یہ ادارہ براہ راست مخالفین کی زد میں آ گیا۔ ایوان صدر میں گلڈ کی تقریبات منقطع ہو گئیں اور جمیل الدین عالی جو ابتدائی چند برسوں میں اس انجمن کو مستحکم کرنے اور فعال بنانے کے روح رواں تھے' طرح طرح کی انتقامی کارروائیوں کی لپیٹ میں آ کر ایک دو بار اپنی ملازمت سے بھی ہاتھ دھو بیٹھے۔ گلڈ کے متعلق غلط فہمیوں اور مخالفتوں کا یہ طوفان صرف سرکاری سطح تک ہی محدود نہ تھا' بلکہ اس قسم کا انداز فکر قومی صحافت کے ایک ذی اثر' با رسوخ اور مقتدر حلقے میں بھی جاری و ساری تھا۔ میں اسے اپنی بدقسمتی سمجھتا ہوں کہ صحافت کے اس شعبے کو ہم اپنا نکتہ نظر باور کرانے میں ناکام رہے۔ ادب کی طرح میں صحافت کو بھی ایک شریف اور باوقار پیشہ سمجھتا ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ وقت کا دھارا اور تعصبات کے خس و خاشاک کو اپنے ساتھ بہا لے جائے گا' جو ہم عصری تناؤ اور کھچاؤ سے پیدا ہوتا ہے۔ رفتہ رفتہ ماحول بدل جاتا ہے اور اس ماحول میں کھینچا تانی کرنے والے لوگ بھی پردہ عدم میں روپوش ہو جاتے ہیں۔ اس کے بعد صرف تاریخ کا آئینہ باقی رہ جائے گا۔ جس میں کسی ملمع سازی کے بغیر گلڈ کا وہی عکس نظر آئے گا' جو واقعی اس کا اپنا ہے۔

اس وقت تک کے لیے میری یہی گذارش ہے کہ:

For more books visit www.4Urdu.com

اگر سیاہ دلم داغ لالہ زار تو ام
وگر کشادہ جبینیم گل بہار تو ام

URDU4U.COM

ان چند درچند اندرونی الجھنوں اور مشکلات کے علاوہ یونہی بیٹھے بٹھائے خواہ مخواہ ہمارے سر پر بیرونی سطح کی ایک افتادہ بھی نازل ہو گئی۔ گلڈ کے منشور میں درج تھا کہ یہ انجمن کسی صورت میں کسی غیر ملکی حکومت یا ادارے سے کوئی امداد قبول نہ کرے گی۔ یہ شرط ہم نے اس زمانے میں عائد کی تھی' جبکہ ہمارے ملک کا بال بال امریکی امداد کے شکنجے میں جکڑا ہوا تھا۔ ہمارا عام سرکاری یا نیم سرکاری یا سراسر غیر سرکاری چلن یہی بن گیا تھا کہ کسی نئے منصوبے کا ڈول ڈالنے سے پہلے یہ لازمی تھا کہ امریکی یا دیگر بیرونی ذرائع سے مال وسائل کی فراہمی کومٹ کرا لی جائے۔ اس بندھی بندھائی ڈگر سے اپنی آزادی اور خودمختاری کی تشہیر کے لیے ہم نے بیرونی وسائل سے گلڈ کے بے نیازی کا ڈھنڈورا کچھ اس طرح پیٹا کہ یہ نامانوس شور و شغب امریکن سفارت کاروں کے ذوق سماعت پر گراں گزرا۔ وہ اس بات کے خوگر ہو چکے تھے کہ عام طور پر پاکستانی ادارے وجود تو بعد میں آتے ہیں' لیکن ان کے لیے امریکی امداد کا بندوبست پہلے کر لیا جاتا ہے۔ اب گلڈ کی اس مختارانہ لاف زنی کو سن کر انہیں یہی گمان گزرا کہ کنگال ملک کے کنگال ادیبوں نے مل جل کر ایک انجمن بنائی ہے۔ ملک کے بہت سے دوسرے اداروں کی طرح آج نہیں تو کل یہ گلڈ بھی ہمارے سامنے دست سوال دراز کرنے پر مجبور ہو جائے گا' لیکن جب ایسا نہ ہوا' تو کچھ امریکنوں کے دل میں یہ شک پیدا ہوا کہ ممکن ہے درپردہ یہ ادارہ روس سے اپنی قیمت وصول کر رہا ہو' کیونکہ ہماری بیوروکریسی اور قومی صحافت کے کچھ حلقے یہ تاثر دے ہی رہے تھے کہ گلڈ دراصل بائیں بازو کے "سرخوں" کی کمین گاہ کے طور پر کام کر رہا ہے۔ اس طرح امریکی سفارت خانے کی نظر میں بھی پاکستان رائٹرز گلڈ ایک تخریبی ادارہ تھا۔

For more books visit www.4Urdu.com

دوسری طرف روسی سفارت خانے سے بھی ہمارا بالکل کوئی رابطہ نہ تھا' بلکہ ایک بار تو وہ میرے ساتھ بہت ناراض ہو گئے۔ بات یہ ہوئی کہ سوویت رائٹرز یونین نے مجھے پاکستان رائٹرز گلڈ کے سیکرٹری جنرل کی حیثیت سے اپنے ایک سالانہ اجلاس میں شریک ہونے کی دعوت دی اور ساتھ ہی ایک پیغام بھی مانگا' لیکن یونین کو جو پیغام میں نے بھیجا' اس کا لب لباب یہ تھا۔ "سوویت رائٹرز یونین کے حالیہ سالانہ اجلاس کا ایجنڈا بڑا وسیع اور دلچسپ ہے۔ فی زمانہ دنیا کے کئی حصوں میں آزادی اور خود مختاری کی جو تحریکیں چل رہی ہیں۔ ان میں سے چند ایک ذکر آپ کے ایجنڈے میں شامل ہے' لیکن باقی ایسی ہی بہت سی اہم تحریکوں کو مکمل طور پر نظر انداز کر دیا گیا ہے۔ اس تفریق کی وجہ میری سمجھ سے بعید ہے مثال کے طور پر ریاست جموں و کشمیر کے تنازعہ پر غور فرمایئے۔ جہاں تک مجھے علم ہے۔ آپ کی یونین نے اپنے پلیٹ فارم پر اس مسئلہ کو کبھی پیش ہونے کا موقع نہیں دیا۔ غالباً نہ ہی آپ کے سامنے کبھی یہ معاملہ زیر غور آیا ہے کہ سوویت یونین جیسی عظیم پاور جو دنیا کے کئی حصوں میں مظلوم اور محکوم قوموں کے حق خودارادیت اور آزادی کی زبردست علمبردار ہے۔ وہ سکیورٹی کونسل میں کشمیری عوام کو یہ حق دینے کے خلاف بار بار اپنا ویٹو استعمال کرتی ہے؟ اگر میں آپ کے سالانہ اجلاس میں شامل ہوا تو مجھے امید ہے کہ مجھے آپ یہ سوالات اٹھانے کی اجازت مرحمت فرمائیں گے۔" یہ پیغام پا کر سوویت رائٹرز یونین نے میرے دعوت نامے کی بات ہی گول کر دی۔ کچھ عرصہ بعد (یہ پیغام بھیجنے کے بعد) ایک سفارتی تقریب میں میری مڈبھیڑ روسی سفیر سے ہو گئی۔ وہ بڑا جھنجھلایا ہوا اور سیخ پا نظر آتا تھا۔ اس نے نہایت کڑوے الفاظ میں مجھے مطلع کیا کہ سوویت رائٹرز یونین میں میرے پیغام کو نہایت ناپسندیدگی کی نگاہ سے دیکھا گیا ہے۔

کچھ ماہ بعد میں صدر ایوب کے ہمراہ نیپال کے دورہ کھٹمنڈو گیا ہوا تھا۔ وہاں پر ان دنوں چند روسی ادیبوں کا ڈیلیگیشن بھی آیا ہوا تھا۔ ایک سرکاری تقریب میں ان کے ساتھ

For more books visit www.4Urdu.com

میرا سامنا ہوا' تو انہوں نے مجھے اپنے نرغہ میں لے لیا اور کوئی گھنٹہ بھر تک رائٹرز یونین کے نام میرے پیغام کو تکا بوٹی کرتے رہے۔ ان کی تلخ و ترش گفتگو میں بار بار ٹیپ کا بند یہی آتا تھا کہ میں امریکنوں کے ہاتھ بکا ہوا پٹھو ہوں۔ میرا انداز فکر شاویانہ سامراجیت سے بری طرح آلودہ ہے اور میرا دماغ سوویت یونین کے خلاف امریکی جارحانہ پروپگنڈے کے دھوون میں پوری طرح دھلا ہوا ہے' اس بے سرو پا الزام تراشی سے کسی قدر آزردہ ہو کر میں ایک طرف کو ہٹ کر بیٹھ گیا۔ ابھی بیٹھا ہی تھا کہ نیپال کی ہوائی فوج کے کمانڈر انچیف کی بیوی لپک کر آئی اور ڈوگری زبان میں مجھے اس طرح الگ تھلک گم سم بیٹھنے کی وجہ پوچھنے لگی۔ یہ جموں کے مضافات کی ایک پڑھی لکھی' طرحدار ڈوگرہ خاتون تھی اور پرنس آف ویلز کالج جموں کے ناطے سے مجھے جانتی تھی۔ میں نے اسے روسی ادیبوں کی تلخ نوائی سے آگاہ کیا' تو وہ کھلکھلا کر ہنسی جیسے پہاڑی جھرنا پھوٹتا ہے۔ پھر ڈوگری زبان میں اس نے مجھے دو بھینگوں کا قصہ سنایا' جس سے سلیس اردو میں یہ نتیجہ اخذ ہوتا تھا کہ اگر امریکی بھینگا تمہیں روس کی گود میں بیٹھا دیکھتا ہے اور روسی بھینگے کو تم امریکہ کی گود میں نظر آتے ہو' تو یقین جانو کہ تم واقعی پاکستان میں ہو!

پاکستان رائٹرز گلڈ کے سیکرٹری جنرل کے طور پر مجھے دو بار منتخب ہونے کا اعزاز حاصل ہوا۔ اس ابتدائی دور میں گلڈ کی تنظیم و تعمیر کا سہرا دراصل جمیل الدین عالی کے سر ہے۔ اپنی نوابانہ کجلاہی' شاعرانہ نازک' مزاجی' جبلی زودرنجی' ذکی الحسی اور طبعی لاابالی پن کے باوجود انہوں نے جنون کی حد تک دھن' لگن اور خلوص کے ساتھ گلڈ کے لیے انتھک کام کیا۔ طرح طرح کے نامساعد حالات میں انہوں نے ہر قسم کی مخالفت اور مزاحمت کا ڈٹ کر مقابلہ کیا اس معرکہ آرائی میں انہیں انواع اقسام کے مصائب اور اذیتوں سے بھی گزرنا پڑا۔ ایک بار تو وہ اسی کش مکش میں کچھ عرصہ کے لیے اپنی ملازمت تک سے ہاتھ دھو بیٹھے۔ لیکن گلڈ کے لیے ان کے جذبہ خدمت میں کوئی کمی

For more books visit www.4Urdu.com

نہ آئی۔ میں نہایت ایمان داری سے اس بات کی گواہی دیتا ہوں کہ گلڈ کے ادارے سے عالی صاحب نے اپنی ذات کے لیے کوئی فائدہ نہیں اٹھایا۔

URDU4U.COM

رائٹرز گلڈ جب وجود میں آیا' تو اس کے منشور کے مطابق ہمارے عزائم نہایت بلند تھے۔ میں اپنی بے توفیقی اور عدم صلاحیتی کا اعتراف کرتا ہوں کہ ہم انہیں پورا کرنے میں بڑی حد تک ناکام رہے۔ ان ناکامیوں میں سرفہرست گلڈ اشاعت گھر ہے۔ یہ قائم تو ہوا تھا اور غالباً بیس بائیس کتابیں شائع بھی ہوئی تھیں' لیکن اس سے آگے نہ چل سکا۔

"ہم قلم" کے نام سے گلڈ کا اپنا ادبی رسالہ بھی جاری ہوا تھا' لیکن تھوڑا سا عرصہ چل کر بند ہو گیا۔

اکیڈمی آف فرانس کے خطوط پر ہم نے پاکستان اکیڈمی آف لیٹرز کا منصوبہ بھی تیار کیا تھا لیکن اس پر بھی کوئی پیش رفت نہ ہو سکی۔ ابھی حال میں اسلام آباد میں اکیڈمی آف لیٹرز کے نام سے جو ادارہ قائم ہوا ہے۔ اس سے ہمارے منصوبے کے ساتھ دور کا بھی واسطہ نہیں موجودہ اکیڈمی آف لیٹرز بظاہر ایک رسمی سی محکمانہ کارروائی نظر آتی ہے جو ایک ادنیٰ ملحقہ ڈیپارٹمنٹ (Minor Attached Department) یا بلدیاتی سطح پر ادبی میونسپل کمیٹی درجہ سوئم کی حیثیت رکھتی ہے۔ موجودہ صورت میں یہ ادارہ محض وقت اور وسائل کا ضیاع ہے۔

ادیبوں کے لیے گروپ انشورنس فراہم کرنا بھی گلڈ کے اہم مقاصد میں شامل تھا' تا کہ بیماری کی حالت میں علاج معالجہ اور موت کی صورت میں لواحقین کے لیے مالی امداد کا خاطر خواہ بندوبست ہو سکے۔ پریمیم ادا کرنے کے لیے ہمارے پاس وسائل کی کمی' اور رعایت حاصل کرنے کے لیے انشورنس کمپنیوں کے عدم توجہی سے یہ مقصد بھی عملی جامہ نہ پہن سکا۔

ناکامیوں کی اس طویل فہرست کے مقابلہ میں گلڈ کا کوئی ایسا عظیم کارنامہ نہیں' جو ان کی تلافی کے طور پر پیش کیا جا سکے۔ لے دے کے ہمارا واحد اثاثہ عزت نفس کا وہ

For more books visit www.4Urdu.com

احساس تھا جو گلڈ کی تنظیم نے ادیبوں کی برادری کیلیے یقینی طور پر اجاگر کیا تھا۔ سونے چاندی کی دنیا میں اس اثاثے کی کوئی وقعت نہیں' لیکن انسانیت کے ترازو میں اس کا وزن بھاری ہے۔

URDU4U.COM

اس زمانے میں یہ چلن تھا کہ مشرقی اور مغربی پاکستان میں کئی ادیبوں کی ذاتی آزادی ان پڑھ پولیس افسروں اور نیم خواندہ مجسٹریٹوں کے رحم و کرم پر منحصر ہوتی تھی۔ ایسے ادیب نہ کسی اخلاقی جرم میں ملوث ہوتے تھے۔ نہ کسی سیاسی بداعمالی کا ارتکاب کرتے تھے۔ لیکن پولیس کے فرضی روزنامچوں کی بنیاد پر وقتہ فوقتہ گرفتار کر کے جیل میں ٹھونس دیئے جاتے تھے۔ نہ کبھی ان پر مقدمہ چلایا جاتا تھا۔ نہ کوئی فرد جرم عائد ہوتی تھی' لیکن پھر بھی یونہی وہ طویل طویل عرصہ تک کسمپرسی کی حالت میں بے یارومددگار جیلوں میں پڑے سڑتے رہتے تھے۔ ہم نے گلڈ کے نام پر ایسے بے گناہ اور معتوب اور مظلوم ادیبوں کی حمایت کا بیڑا اٹھایا اور ان کوششوں کے نتیجہ میں درجنوں محبوس ادیبوں کو رہائی نصیب ہوئی۔

گلڈ کے تصورات' مطالعاتی رپورٹوں اور قراردادوں کی بنیادوں پر ہی کاپی رائٹ کا قانون جاری ہوا۔ نیشنل بک کونسل قائم ہوئی اور مرکزی اردو بورڈ بنا جس کا مقصد اردو کو قومی نفاذ کی سطح پر لانا اور تمام تعلیمی اور درسی ادبیات اور کتابیات کو اردو میں منتقل کرنا تھا۔

آدم جی فاؤنڈیشن' داؤد فاؤنڈیشن اور نیشنل بنک آف پاکستان کے مہیا کردہ وسائل سے پانچ ادبی انعامات قائم کئے گئے' جو غالبًا اب تک جاری ہیں۔ کئی بار اس بات پر تنقید اور تنقیص اور تنازعات کے طوفان اٹھتے رہے کہ فلاں کتاب کو انعام کیوں ملا اور فلاں کتاب کیوں نظر انداز کر دی گئی۔ ادبی تخلیقات کے معیار کی جانچ پڑتال میں یہ کوئی انوکھا سانحہ نہیں ہے۔ اس سلسلے میں ایسے اختلافات کی گنجائش ہمیشہ موجود رہنے کا امکان ہے قطع نظر اس کے کہ جج صاحبان گلڈ نے نامزد کئے ہوں یا کسی اور ادارے نے۔

جن دنوں گلڈ کا قیام ظہور میں آیا' اسی زمانے میں مارشل لاء حکام نے ایک بنک میں

For more books visit www.4Urdu.com

قریباً آٹھ لاکھ روپے کی رقم ضبط کی تھی جو چند سیاستدانوں نے انتخابات میں کام لانے کے لیے خفیہ کھاتوں میں جمع کی ہوئی تھی۔ میری تجویز پر صدر ایوب نے اس رقم سے صدر کا ویلفئیر فنڈ قائم کر دیا' جس کا مقصد غریب اور معذور افراد کی مالی مدد کرنا تھا۔ رفتہ رفتہ میں نے اس ویلفئیر فنڈ میں دو لاکھ روپے کی رقم اس مقصد کے لیے مختصف کرالی کہ اس سے بیامری کی حالت میں معذور ادیبوں' صحافیوں اور فنکاروں کی وقتی مدد اور وفات کی صورت میں حاجت مند لواحقین کی اعانت کی جا سکے۔ ویلفئیر فنڈ کے اس حصہ کو چلانے کے لیے جو کمیٹی بنی' اس کا چئیرمین مجھے مقرر کیا گیا۔ میں نے یہ طریق کار اختیار کیا تھا کہ اگر کسی ادیب کے حالات اور کوائف کی تصدیق کروانی ضروری سمجھی جاتی تھی' تو یہ کارروائی گلڈ کے علاقائی دفتر کے ذریعہ کروائی جاتی تھی۔ میں نے سنا ہے کہ اس قسم کا امدادی فنڈ اب بھی قائم ہے اور اس میں رقم کی مقدار پہلے سے کئی گنا زیادہ تقسیم ہوتی ہے' لیکن ساتھ ہی یہ بھی شنید ہے کہ انکوائری کا کام انتظامیہ سے لیا جاتا ہے۔ کبھی پولیس والے تفتیش کرنے ادیبوں کے گھروں میں آ گھستے ہیں۔ کبھی مرحوم ادیب کے پس ماندگان کو تھانے میں طلب کیا جاتا ہے۔ اگر یہ صورت حال صحیح ہے' تو میرے نزدیک مناسب نہیں' ادیب کے حالات کی ٹوہ ادیب کے ذریعہ ہی لگانی چاہیے۔ پولیس کانسٹیبل کے ذریعہ نہیں۔

لاہور میں اسمبلی ہال کے پیچھے ایک وسیع احاطے میں جو گلڈ ہاؤس قائم ہے۔ پہلے یہ ایک ہوٹل تھا۔ یہ متروکہ جائیداد تھی اور بہت سے طاقتور اور ذی اثر لوگ اسے مستقل طور پر اپنے نام منتقل کرانے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگا رہے تھے۔ گلڈ کے لیے اس قیمتی املاک کو حاصل کرنا آسان کام نہیں تھا۔ یہ داستان طولانی ہے اور اسے بیان کرنے میں خواہ مخواہ کسی قدر خودستائی کا پہلو نکلنے کا اندیشہ ہے۔ بس اسی قدر لکھنا کافی ہے کہ جمیل الدین عالی کے ساتھ ملکر میں نے کسی قدر تگ و دو کے بعد یہ جگہ بحالیات سے گلڈ کے نام منتقل کروا لی۔ اس کے بعد کئی سال تک اس الاٹمنٹ کے خلاف اپیلیں

For more books visit www.4Urdu.com

چلتی رہیں۔ اس مقدمہ بازی میں ریاض انور نے گلڈ کی طرف سے انتہائی محنت' مستقل مزاجی اور قابلیت سے عدالتوں میں پیروی کی۔ آخری اپیل جیتنے کے بعد عمارت کا پورا قبضہ حاصل کرنا اور بہت سے ناجائز قابضین کو وہاں سے بیدخل کرنا ایک الگ مسئلہ تھا۔ اس مسئلہ کو کامیابی کے ساتھ سلجھانے کے لیے اس وقت کے جنرل سیکرٹری محمد طفیل صاحب نے بڑی محنت اور لگن سے کام کیا۔ اب یہ بیش قیمت جائیداد بلا شرکت غیرے گلڈ کے قبضہ میں ہے۔ خدا کرے کہ صاحب جائیداد ہو کر بھی گلڈ زراور زمین کے روایتی گڑھوں میں گرنے سے محفوظ رہے اور خود کفیل ہو کر ان وسائل کے ذریعے ادیبوں کی فلاح و بہبود کے عظیم الشان منصوبے پروان چڑھائے۔ مجھے یقین ہے کہ اگر آئین کے مطابق انتخابات ہوتے رہے اور گلڈ کی تنظیمی رگوں میں پابندی سے نیا خون شامل ہوتا رہا تو اس کا وجود کسی نہ کسی حد تک فعال صورت میں قائم و دائم رہے گا۔

ادھر گلڈ قائم ہوا' ادھر بریگیڈیئر ایف آر خان کی رال اس ادارے پر بری طرح ٹپکنے لگی۔ یہ صاحب اس زمانے میں مارشل لاء کی حکومت کے روح رواں سمجھے جاتے تھے اور بزعم خود صدر ایوب کے لیے وہی خدمت سر انجام دینے کے لیے بے چین تھے جو ڈاکٹر گوئبلز نے ہٹلر کے لیے انجام دی تھیں۔ عہدے کے لحاظ سے وہ وزارت اطلاعات و نشریات کے سیکرٹری تھے' لیکن اثر و رسوخ کے اعتبار سے وہ صدر ایوب کو چھوڑ کر باقی سب وزیروں گورنروں اور اعلیٰ حکام پر دھونس جما کر انہیں اپنی ہاں میں ہاں ملانے پر مجبور کرنا اپنے بائیں ہاتھ کا کھیل سمجھتے تھے۔ وہ اپنے آپ کو برملا فوجی حکومت کا "دماغ" سمجھتے تھے اور کسی نہ کسی طریقے سے اس کا اعلان بھی فرماتے رہتے تھے۔

دماغ تو خیر ان کا اتنا ہی بڑا تھا' جتنا کہ ایک عام انسان کا ہوتا ہے' لیکن ان کا ایک خاص ملکہ یہ تھا کہ وہ دوسروں کے دماغ کرید کرید کر ان کے خیالات کو اپنے استعمال میں لانے کے بادشاہ تھے۔ وزارت اطلاعات و نشریات کا چارج لیتے ہی انہوں نے بیورو آف نیشنل ریکنسٹرکشن (ادارہ قومی تعمیر نو) کے نام سے ایک نیا ادارہ قائم کر لیا تھا'

For more books visit www.4Urdu.com

جس کا مقصد قوم کی سوچ کو حکومت کی سوچ کے ساتھ ہم آہنگ کرنا تھا۔ جب گلڈ قائم ہوا' تو بریگیڈیئر ایف۔ آر۔ خان سچ مچ یہی سمجھے کہ میں نے نہایت چالاکی سے ان کے نہلے پر اپنا دہلا مار دکھایا ہے اور گلڈ کے پردے میں ایک ایسا دھوبی گھاٹ بنا ڈالا ہے۔ جہاں پاکستان بھر کے سارے چھوٹے بڑے ادیب حکومت کی تال پر چھوچھو کر قوم کے اجتماعی دماغ کو حسب فرمائش اور حسب خواہش سرکاری صابن سے دھونے کا فریضہ سر انجام دیا کریں گے۔ میرے اس کارنامے پر انہوں نے اپنی خوشنودی کا اظہار کیا اور اس ادارے کو اپنے طور پر کام میں لانے کے لیے انہوں نے پہلے تو ترغیب و تحریص کے روپہلی اور سنہری باغ دکھانے کی کوشش کی' جب یہ موثر ثابت نہ ہوئے' تو انہوں نے اپنے معمول کے مطابق زور آزمائی کا طریق کار اختیار کیا اور مختلف طور طریقوں سے میرا بازو توڑنے مروڑنے کا عمل شروع کیا' لیکن کچھ عرصہ بعد انہیں محسوس ہوا کہ میرا بازو بھی ربڑ کا بنا ہوا ہے' جو نہ چٹختا ہے نہ کھٹکتا ہے نہ ٹوٹتا ہے اس کے بعد بریگیڈیئر ایف۔ آر۔ خان نے اپنا رویہ بدل لیا اور اس نے اب اسی بات پر قناعت کر لی کہ وہ ہمارے گلڈ کے دفاتر سے ممبروں کی فہرست حاصل کرتا رہتا تھا اور بیورو آف نیشنل ری کنسٹرکشن کے نمائندے ایسے ادیبوں کی ٹوہ میں لگے رہتے تھے جو معاوضہ لے کر حکومت کی مرضی کے مطابق کچھ مضامین یا پمفلٹ اردو بنگالی' انگریزی اور دوسری علاقائی زبانوں میں لکھنے پر آمادہ ہو جاتے تھے۔ صدر ایوب کے آئین اور بنیادی جمہوری نظام کی تشہیر میں ان عناصر نے بریگیڈیئر ایف۔ آر۔ خان سے معاوضہ لے کر خاصا کام کیا۔ یہ عناصر نہ گلڈ نے پیدا کئے تھے' نہ گلڈ کی وجہ سے پیدا ہوئے تھے۔ ادیبوں کی برادری میں ایسا بکاؤ مال ہر دور میں موجود رہا ہے اور رہے گا۔ گلڈ کی رکنیت ان کے لیے نہ کوئی رکاوٹ ہے نہ اعانت۔

اب گلڈ کی عمر ۲۴ سال سے اوپر ہے۔ بعض کے نزدیک یہ ادارہ میرے لیے باعث تمغہ اور بعض کے نزدیک باعث تہمت ہے' لیکن میں اپنے آپ کو نہ تمغہ کا مستحق سمجھتا ہوں' نہ تہمت کا۔ مجھے صرف اس بات پر فخر ہے کہ گلڈ کے قیام میں مجھے کچھ حصہ

For more books visit www.4Urdu.com


لینے کا موقع نصیب ہوا۔

○○○

For more books visit www.4Urdu.com

## • صدر ایوب اور صحافت

صدارت سنبھالنے سے پہلے اخبارات میں صدر ایوب کی دلچسپی کا مرکز سٹاک ایکسچینج والا صفحہ ہوا کرتا تھا۔ فوج کی ملازمت کے دوران وہ اپنی بچت سے تجارتی اور صنعتی کمپنیوں کے حصص خریدا کرتے تھے اور ان کے بھاؤ کے اتار چڑھاؤ پر کڑی نظر رکھنا ان کا روز بروز کا مشغلہ تھا۔

ان کے ذہن میں یہ بات پتھر پر لکیر کی طرح جمی ہوئی تھی کہ ہماری معاشرے میں چھپے ہوئے حرف کی بے انتہا قدر و قیمت ہے۔ وہ اکثر کہا کرتے تھے کہ بڑے سے بڑے جھوٹ کو پرنٹنگ پریس کی مشین سے گزار کر کاغذ پر پھیلا دیا جائے تو کئی لوگوں کی نظر میں وہ قابل قبول اور قابل اعتبار بن جاتا ہے۔ اس لیے وہ مذاق سے پرنٹنگ پریس کو ذہنی جنگ کا اسلحہ خانہ کہا کرتے تھے۔ اقتدار میں آتے ہی صدر ایوب نے وزارت اطلاعات کے سربراہ بریگیڈیئر ایف۔ آر۔ خان پر طرح طرح کے سوالات کی بوچھاڑ کر دی۔ اخبارات کے مالکوں کے تعلیمی اور مالی وسائل کیا ہوتے ہیں؟ جرنلزم کا پیشہ اختیار کرنے کے لیے ایڈیٹروں اور صحافیوں کی تعلیم و تربیت اور ٹریننگ کا کیا بندوبست ہے؟ چھاپہ خانہ کے مالکوں کو پرنٹنگ پریس کے ناجائز استعمال سے کس طرح روکا جاتا ہے؟ صحافیوں کی ملازمت کی شرائط اور اجرت مقرر کرنے کا کیا طریق کار رائج ہے؟

صدر ایوب اپنا یہ نظریہ دو ٹوک انداز میں بیان کیا کرتے تھے کہ معمولی سے معمولی ڈسپنسری میں مرہم پٹی کرنے اور ٹیکا لگانے کے لیے جو کمپاؤنڈر رکھے جاتے ہیں۔ انہیں اس کام کی پہلے سے باقاعدہ ترتیب دی جاتی ہے' لیکن قوم کے ذہن میں صبح و شام ٹیکا لگانے کے لیے جو لوگ صحافت کا پیشہ اختیار کرتے ہیں۔ ان کے لیے کسی قسم کی ٹریننگ حاصل کرنا بالکل لازمی نہیں۔

بریگیڈیئر ایف۔ آر۔ خان صدر ایوب کی نفسیات سے خوب واقف تھے اور ان کی چشم